مطبوعات جدیدہ

مسدس بے نظیر مصنفہ جان صاحب، مرتبہ جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری تقطیع چھوٹی،

ضخامت ۱۹۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:- خسرو باغ روڈ ریاست رامپور،

نواب کلب علی خان والی رامپور بڑے علم دوست، علمار نواز اور علم وفن کے بڑے قدر دان و سرپرست تھے، اس دور کے بہت سے نامور علمار وشعرار اور ادبا، دربار رامپور سے وابستہ تھے، نواب موصوف کے زمانہ مین بعض تمدنی کام بھی انجام پائے، اس سلسلہ مین انھون نے اپنی تخت نشینی کی یادگار مین ۱۸۶۶ء مین ایک میلہ قائم کیا تھا، یہ بڑا تاریخی میلہ تھا، سرکاری انتظام مین باغ بے نظیر مین لگتا تھا، نواب ممدوح خود بہ نفس نفیس اس مین شریک ہوتے، ہر فن کے باکمال اس میلہ مین اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے تھے، شعر وادب کی محفل بھی جمتی تھی، چنانچہ دربار رامپور کے بہت سے شعراء نے میلہ اور باغ بے نظیر کی تعریف مین اشعار کہے تھے، مشہور ریختی گو جان صاحب نے ایک مستقل مسدس مسدس بے نظیر تصنیف کیا تھا، جو اب تک نہین چھپا ہے، اس کا قلمی نسخہ ریاست کے کتبخانہ مین موجود تھا، جناب اثر رامپوری نے اسکو ایک مبسوط مقدمہ کیساتھ شائع کیا ہے، مسدس تو کل ۴۳ صفحون کا ہے، لیکن مقدمہ کی حیثیت مستقل تصنیف کی ہے، اس مین لائق مصنف نے بڑی تلاش وجستجو سے تاریخی وادبی ماخذون، شعرار کے دواوین اور رامپور کے پرانے بزرگون کی معتبر زبانی روایات سے میلہ اور باغ بے نظیر کے مفصل حالات تحریر کئے ہین، اور جان صاحب کے مسدس اور دوسرے شعرار کے کلام مین جن لوگون کے نام یا جو اشارات آئے ہین، ان کے مختصر حالات اور ان کی تشریحات تحریر کی ہین، اس طرح اس مقدمہ مین اس دور کے رامپور کی نہایت دلچسپ تمدنی تصویر آگئی ہے، جس کا اب صرف تاریخون مین ذکر ملے گا،

"م"

جلد ۶۶ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۵ عیسوی عدد ۶

مضامین

شذرات

معارف نے ہمیشہ مذاقِ عام سے اپنا دامن بچایا اس لئے آج تک اس کا کوئی خاص نمبر نہیں نکلا لیکن بعض حالات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ پرانی روش سے ہٹنا ضروری ہو جاتا ہے، انہی میں مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات بھی ہے، مرحوم کی ذاتِ گرامی ایسے گوناگون اوصاف و خصوصیات کی جامع تھی کہ ایسے نمونے اب دیکھنے میں نہ آئیں گے، بلکہ وہ اپنے زمانہ میں بھی ان اوصاف میں منفرد تھے، اُن کی وفات سے فضل و کمال، علم دوستی و علماء نوازی تقویٰ و دیانت تہذیب و شرافت سیرت کی استواری و وضعداری کی جامعیت کا خاتمہ ہو گیا، اس لئے اُن کی یادگار درحقیقت ان اوصاف و کمالات اور علم و فن کی یادگار ہے،

اس عمومی حیثیت کے علاوہ مرحوم کو دار المصنفین سے خاص تعلق تھا، وہ مولانا شبلی مرحوم کے بڑے گہرے اور مخلص دوست تھے، اُن کی وفات کے بعد یہ ربط و تعلق اُن کی یادگار دار المصنفین کی جانب منتقل ہو گیا، چنانچہ مرحوم اس کے بڑے قدردان و بہی خواہ، مجلس دار المصنفین کے رکن رکین اور اس کے صدر نشین تھے اسلئے دار المصنفین پر اُن کا بڑا حق تھا جس کو وہ اُن کی علمی یادگار ہی کی شکل میں ادا کر سکتا تھا،

اس نمبر میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کی زندگی کے تمام اہم پہلو اور اُن کی نمایاں خصوصیات سامنے آجائیں چنانچہ متعدد مضامین ایسے اصحاب علم و قلم کے ہیں جن کو برسوں مرحوم کے ساتھ رہنے یا اُن کو زیادہ قریب سے مسلسل دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس لحاظ سے یہ نمبر اُن کی زندگی کا نہایت مستند مرقع ہے، حضرۃ الاستاذ مدظلہ کا مضمون ایسے وقت ملا جب معارف کا ابتدائی حصہ چھپ چکا تھا لیکن مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے اُس کو مع مقالہ رکھنا ضروری تھا، اس سے صرف چند ابتدائی مضمون کے بند سے مکرر ہو گئے ہیں، باقی اور کوئی فرق نہیں آیا ہے، ان گذارشات کے ساتھ مولانا شروانی مرحوم کی زندگی کا یہ مرقع اور ان کی علمی یادگار ناظرین معارف کی خدمت میں پیش ہے

مقالات

آہ! مولانا شروانی

از

سید سلیمان ندوی

اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ لاہور کے کسی اخبار میں سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہو گیا، خبر پڑھ کر دل دھک سے ہو گیا، اور اپنی دوری، مجبوری، اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا، میں نے مرحوم کی زندگی ہی میں اُن کے واقعات اور خاندانِ شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دار المصنفین میں رکھ لئے تھے، اب جب اُن کا سانحہ پیش آیا، تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی،

مرحوم نے چھیاسی سال کی عمر میں بتاریخ ۱۱ اگست سنہ ۱۹۵۰ء اس دنیائے رنگ و بو کو خیرباد کہا، اور سلف صالحین سے جا ملے، مرحوم سے میرے تعلقات اس قدر گوناگون تھے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کو کہاں سے شروع کیا جائے، اور کیا کہا جائے اور کیا چھوڑا جائے، میں نے موصوف کو سب سے پہلے سنہ ۱۹[illegible]ء میں نصف صدی پہلے پٹنہ کے اجلاس ندوہ میں دیکھا تھا، بھرا شباب، مردانہ حسن و جمال، سپید رنگ، سیاہ خوبصورت داڑھی، اور سر پر زلفیں، بلند و بالا قامت، لطیف و قیمتی لباس، جلسہ کے ہر اجلاس میں نیا جوڑا زیب بدن، کبھی سر پر عمامہ، کبھی گول ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی، جدھر نکل جاتے آنکھیں اُٹھ جاتیں انگلیاں اشارہ کرتیں لوگ ایک دوسرے کو دکھاتے اور بتاتے، اسی طرح میں نے دیکھا، اور بتایا گیا کہ یہ علی گڈھ

اور مرجھایا تھا، اوسی وقت دل نے کہا کہ یہ چراغِ سحر بجھا ہی چاہتا ہے،

میرا عمر بھر یہ دستور رہا کہ حضرۃ الاستاذ کے مخصوص احباب اور دوستوں سے بزرگداشت کا تعلق رکھوں اور ہمیشہ اُن کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھوں چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خورد اور اُن کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا، مین انھین مخدوم لکھتا وہ عزیز لکھتے، دار المصنفین کی تاسیس مین مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ رہنما رہی، دار المصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوئے، اس تعلق سے بھی اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ اکثر رہا کیا، ایک دفعہ جب احباب اور بزرگون کے محفوظ خطوط گنے تو سب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے، وہ انہی کے تھے، مین نے جب انھین اس کی اطلاع دی، تو اُس پر مسرت ظاہر فرمائی، اور لکھا کہ اس مین تعجب کی کیا بات ہے، اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا،

وہ قدیم و جدید تعلیم کا بہترین مجموعہ تھے، فارسی و عربی تعلیم گھر پر حاصل کی، عربی کی ادبی کتابین حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڈھی کے درس مین پڑھین، انگریزی تعلیم میٹرک تک آگرہ اسکول آگرہ مین پائی، اُن کی جوانی تک علم و فن اور دین و تقوی کے باکمال اکابر موجود تھے، وہ ہر ایک کے در تک پہنچے اور ہر ایک سے حسبِ استعداد کسبِ فیض کیا، شیخ حسین یمنی عرب مقیم بھوپال سے سندِ حدیث حاصل کی، قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی سے فیض پایا، بیعت قطب الوقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی سے کی تھی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کی زیارت سے بھی فیض یاب تھے،

اُن کا سب سے پہلا مضمون جس نے لوگون سے خراجِ تحسین وصول کیا، وہ بابر ہے، جو رسالہ حسن حیدرآباد مین چھپا تھا، اور جس پر مصنف کو ایک اشرفی انعام ملی تھی، مولانا شبلی کی المامون پر اُن کا تبصرہ اُن کا پہلا تنقیدی کارنامہ ہے، جو غالباً ۱۸۸۹ء مین شوق قدوائی کے اخبار آزاد مین چھپا تھا، اُن کے رسائل مین دو بہترین تاریخی رسائل ہین، یہ دونون ندوہ کے سالانہ جلسون مین پڑھے گئے تھے، پہلے کا نام علمائے سلف ہے،

کے ایک رئیس عالم ہین،

۱۹۰۱ء مین جب مین ندوہ آیا، تو مدرسہ اُن کے ذکرِ جمیل سے پرشور تھا، انتظامی جلسے سال مین چند بار ہوتے، اور وہ اُن مین جب آتے تو جلسہ کی اہمیت بڑھ جاتی، ۱۹۰۴ء مین جب الندوہ نکلا، اور وہ اس کے اڈیٹر ہوئے، اور میرے ایک دو مضمون اس مین نکلے تو تعارف بڑھا، اور جب وہ آتے، تو مین حاضر ہوتا اور وہ اپنے بزرگانہ لطف و نوازش سے نوازتے، ۱۹۰۶ء مین جب میری جماعت کی دستاربندی کا جلسہ ہوا اور خاکسار کی عربی تقریر نے حاضرین سے دادِ تحسین حاصل کی، اور حضرۃ الاستاذ نے خوش ہو کر اپنے سر سے عمامہ اُتار کر میرے سر پر رکھی تو اُس جلسہ مین مولانا شروانی شریک تھے، تاہم حضرت الاستاذ نے خود اپنے قلم سے لکھ کر اُن کو اس واقعہ کی بڑی مسرت سے خبر دی، (یہ خط مکاتیب شبلی مین درج ہے) استاد کی یہ وساطت مولانا شروانی سے تقریب کا نیا ذریعہ بنی،

۱۹۱۰ء مین جب مکاتیب شبلی کی تدوین کا خیال آیا، تو اُستاد نے پھر مولانا شروانی سے تقریب کی، کہ اُن کے پاس شبلی کے جو خطوط ہون وہ سید سلیمان کو دیئے جائین، ۱۹۱۲ء مین جب ندوہ مین حضرۃ الاستاذ کے حسبِ ایما انگریزی مدارس کے نصابِ تاریخ کی غلطیون کی تصحیح کا کام میرے سپرد ہوا تو پھر تازہ تقریب کی گئی، نومبر ۱۹۱۴ء مین جب حضرۃ الاستاذ بیمار ہوئے، اور حالت مایوسی کو پہنچی تو خاکسار حاضرِ خدمت تھا، سب سے پہلے مین نے اس شدتِ تعلق کی بنا پر جو اُن دونون دوستون مین تھا، اس مضمون کا ایک مختصر کارڈ اُن کو بھیجا "افسوس کہ الفاروق کا مصنف اس وقت موت و حیات کی کشمکش مین ہے"، ۱۸ نومبر کو مولانا نے وفات پائی، اس کی اطلاع دی، اس کے بعد سے جو اُن سے مکاتبات کا سلسلہ شروع ہوا، تو آج سے دو برس پہلے تک اُس وقت تک برابر قائم رہا جب تک اُن کی قوتِ حافظہ اور عام قوتِ جسمانی کام دیتی رہی، آج سے دو سال پہلے مین علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ مین سب سے آخری دفعہ اُن سے ملا، مین نے دیکھا کہ اُن کا نیم سا قد نیم کمان بن چکا ہے، وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا، پژمردہ

اور دوسرے کا نام نابینا علماء یہ دونوں انیسویں صدی کی یادگار ہیں، ۱۹۰۱ء میں لاہور سے جب مخزن نکلا، تو اس کی محفل میں بھی یہ شریک تھے، حضرت خسرو کے غزلیات پر اس میں اُن کا مضمون چھپا تھا، ۱۹۰۷ء میں الندوہ کے شریک اڈیٹر ہوئے، تو اخلاق پر اُن کے مضامین نکلے،

علی گڈھ کی مجلسوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں الصدیق لکھ کر پیش کی جو ان کی میلاد کی مجلسوں کے وہ بانی تھے، اُن میں سیرۃ پر مختلف رسائل لکھے، جو چھپے اور پھیلے، معارف میں اُن کے مضامین اور اُن کی غزلیں اکثر زیب اوراق رہیں،

شعر و شاعری کا ذوق اُن کو آغاز سے تھا، حسرت تخلص کرتے تھے، اردو اور فارسی دونوں میں مشق سخن کرتے تھے، اردو میں حضرت امیر مینائی سے اصلاح اور فارسی میں مولانا شبلی سے مشورہ کرتے تھے، فارسی کے مشہور شاعر حضرت خواجہ عزیز سے بھی مولانا شبلی کے ذریعہ سے تعلق رکھتے تھے،

اُن کے اخلاقی فضائل میں وضعداری بڑی نمایاں تھی، جس سے جتنا ملتے تھے، تمام عمر اسی طرح ملتے رہے، جب لکھنؤ آتے تو منشی احتشام علی صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرتے تھے، اور تمام عمر میں کبھی اس وضع میں فرق نہیں آیا، پھر اس قیام میں جن جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا دستور تھا، اسی طرح وہ جاکر ملتے، اور اتنی دیر بیٹھتے، لکھنؤ میں فرنگی محل اور وہاں بھی مولانا محمد نعیم صاحب کی نشست گاہ میں ضرور حاضر ہوتے،

اُن کی جوانی تھی کہ ندوہ کا غلغلہ بلند ہوا، یہ وہ مجلس تھی، جس کی روحانی اور علمی صدارت جن دو بزرگوں سے نسبت رکھتی تھی، یعنی مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی اور حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب دونوں ہی سے اُن کو قلبی تعلق تھا، اس لئے وہ ندوہ کے اُن اصلی ارکان میں تھے، جن سے ندوہ کی مجلس عبارت تھی، وہ سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے اجلاس ناگپور کے صدر ہوئے، اور یہیں اسی وقت دولت آصفیہ مرحوم کی صدارت امور مذہبی کی خبر عام ہوئی جس کے بعد اُن کا بارہ تیرہ برس کے قریب حیدرآباد میں قیام رہا، اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور شعبہ دینیات کے افتتاح میں اُن کی مساعی مشکور رہیں، حیدرآباد

کا حال وہاں کے مقیم احباب سنائیں گے،

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی وہ دو دفعہ ندوہ کے اجلاس کے صدر ہوئے، پہلی دفعہ انبالہ میں اور یاد آتا ہے کہ دوسری دفعہ لکھنؤ میں مرحوم کو قومی اداروں میں علی گڈھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دار المصنفین اعظم گڈھ سے خصوصیت کا تعلق تھا، مولانا شبلی مرحوم کے بعد غالباً ۱۹۱۵ء میں وہ انجمن ترقی اردو کے بھی ناظم ہوئے، اور دو تین سال کے قریب خدمت کے بعد قرعۂ فال مولوی عبد الحق صاحب کے نام نکلا، ان اداروں کے علاوہ دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بزرگوں سے بھی ارتباط رکھتے تھے، اور ان درسگاہوں کی بھی امداد فرمایا کرتے تھے،

عجیب اتفاق ہے کہ نادانستہ ۱۹۲۶ء میں سفر حج میں بھی میرا ان کا ساتھ ہوا، یہ موتمر اسلامی والا موقع تھا، یہاں یہ سخت بیمار پڑ گئے تھے، مگر بڑی ہمت کے ساتھ سارے ارکان ادا کئے، مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں میں نے اُن کا تعارف شیخ ابراہیم خربوطی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام سے کرا دیا، یہ تعلق چونکہ علمی اور روحانی دونوں تھا، اس لئے بڑا ساز گار آیا، اور اخیر اخیر وقت تک قائم رہا۔ حرمین محترمین کی خدمت بھی وہ سالانہ کیا کرتے تھے، اخیر دفعہ جب دو سال ہوئے، میں نے اپنے ارادۂ حج کی اطلاع ان کو دی تو لکھا کہ اس دفعہ حرمین شریفین کی خدمت کی رقم آپ ہی کے ذریعہ جائے گی، مگر روانگی کے وقت نہ اُن کو یاد رہا، اور نہ میں نے یاد دلایا،

ان کو نادر اور قلمی کتابوں کا بڑا شوق تھا، اور اس شوق کی تاریخ خود انھوں نے لکھ کر معارف میں چھپوائی ہے، مولانا شبلی مرحوم کے ذریعہ سے اور اُن کی پسند سے کتابیں خرید کرتے، لکھنؤ میں عبد الحسین اور واجد حسین قلمی کتابوں کے تاجر تھے، لکھنؤ آتے تو اُن کے نوادر دیکھتے، اور چھانٹ کر لے جاتے، یوں بھی کتابیں اُن کے پاس پہنچتی رہتی تھیں، حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی بہت سی کتابیں حاصل کیں، میں جب ۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ سے واپس آیا، تو عزیزوں اور بزرگوں کے لئے جو تحفے لایا مرحوم کے لئے نستعلیق کے اچھے خطاطوں کی وصلیوں کی

کی عکسی تصاویر کا مجموعہ لاکر پیش کیا،

پہلے تو اصل وطن علی گڈھ مین بھیکم پور مین تھا، بعد کو بھیکم پور سے کچھ دور اپنے نام سے حبیب گنج نام ایک گاؤن آباد کیا تھا، وہین زنانہ اور مردانہ مکانات، مسجد اور ایک کتب خانہ کی عمارت تیار کی تھی، زمینداری کے شغل کے بعد بھی کتب خانہ اُن کی دلچسپی کا مرکز تھا،

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد ہاتھ مین ایک بڑی سی لکڑی لے کر باغ مین سیر کو نکل جاتے، اس وقت ان کے دوسرے ہاتھ مین تسبیح ہوتی، لکھنؤ آتے تو صبح کو پیدل منشی احتشام علی کی کوٹھی واقع خیالی گنج سے مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی کوٹھی ہارڈنگ روڈ تک پیدل جاتے، واپسی سواری پر ہوتی، دارالمصنفین آتے تو احاطہ کے اندر کمرہ کے باہر روش پر ٹہلا کرتے،

ایک دفعہ دارالمصنفین کا جلسۂ انتظامیہ رمضان المبارک مین مقرر کیا، ہم نے عذر کرنا چاہا، تو جواب مین لکھا کہ کیا رمضان مسلمانون کے کام مین مانع ہے، غرض تشریف لائے، اس زمانہ مین وہ چائے کے بجائے اوولٹین پیتے تھے، مین کافی اور مولوی مسعود علی صاحب چائے پیتے تھے، سحری مین یہ تینون شراب الصالحین لائی جاتین اور ہر ایک کا ایک ایک دور چلتا، اور بڑی خوشی سے پیتے، اور بعد کی ملاقاتون مین اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے،

دارالمصنفین کی مسجد مرحوم ہی کی کوشش سے نواب فرتل اللہ خان مرحوم کی امداد سے مولوی مسعود علی صاحب کی نگرانی اور انجینیرنگ مین بنی، پھر دارالعلوم ندوہ کی مسجد بھی برادر موصوف ہی کی نگرانی اور انجینیرنگ مین بنی، مرحوم دونون کو دیکھ کر برادر موصوف کے تعمیری ذوق کو بہت پسند فرماتے تھے، چنانچہ جب وہ علی گڈھ مین حبیب منزل بنوانے لگے، تو مولوی صاحب موصوف کو بلوا کر اُن سے مشورہ کیا، انھون نے جو مشورہ دیا اس مین سے سامنے کی روکار عمارت ہے، فرماتے تھے کہ اگر یہ حصہ نہ بنتا، تو یہ عمارت کچھ نہ ہوتی،

مرحوم کے اخلاق کی دو خصوصیتین عجیب تھین، ایک یہ کہ جس شخص سے جس جہت سے اُن کو تعلق ہوتا،

اس سے اوسی جہت سے ملتے، اور اسی کے متعلق باتین کرتے، اور کسی دوسری جہتون سے اُن کو کوئی تعلق نہ ہوتا، حکیم اجمل خان مرحوم سے گہرے تعلقات تھے، مگر یہ یکجہتی، قدیم قلمی مخطوطات اور قدیم تہذیب و شرافت کے ذوق کی تھی، ان دونون کی ملاقاتون مین یہی تذکرے رہتے، کہین بیچ مین سیاست کا نام بھی نہین آتا، مولانا ابوالکلام سے بھی مولانا شبلی کے واسطہ سے اُن کے تعلقات تھے، اُن کی ملاقات اور مکاتبت بھی جو چھپ چکی ہے، سیاست کے تذکرہ سے خالی ہے، میری زندگی پر مختلف دور گذرے ہین، جن مین سیاست بھی ہی، مگر کبھی کسی خط مین نہ مین نے اُس کے متعلق کچھ لکھا، اور نہ کبھی انھون نے پوچھا،

اُن کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اُن کی مجلس مین کبھی کسی کی بُرائی یا غیبت نہین ہوتی، کوئی کرتا بھی تو اوڑا دیتے، خطوط مین بھی یہی احتیاط تھی، اگر ناگزیر طور سے کچھ ذکر آتا، تو اس طرح اشارہ وکنایہ مین کہتے کہ غیر اوس کے سمجھنے سے قاصر رہتے،

مرحوم کو اچھی اور تاریخی یادگارون کا شوق تھا، بعض بادشاہون کے فرامین، تلوارین یا خنجر اُن کے پاس تھے، مین جب ۱۹۳۳ء مین کابل کے سفر سے واپس آیا، اوس کے بعد مرحوم دارالمصنفین آئے تو قالینون کا تذکرہ نکلا، مین نے عرض کیا کہ نادر شاہ شاہ کابل نے مجھے ایک قالین عنایت کیا ہے، اُن کو دکھایا تو اُس کو پسند کیا، مُلا صاحب جو اُن کے رفیق خاص تھے، اور ہمیشہ سفر مین ساتھ رہتے تھے، فرمایا مُلا جی یہ تو پٹھانون کا مال ہے، ساتھ باندھ لو، چنانچہ وہ قالین اُن کے نذر کر دیا کہ "نہان بشاہان می دہند" فقیرون کے یہان اس کا کیا کام، البتہ شاہ کی دی ہوئی تسبیح سبز شاہ مقصود کی فقیر کے پاس ہے،

مرحوم بزرگون کے قصے لطیفے، حالات اور حکایتین اس قدر ذوق وشوق ولطف سے مجلس مین بیان فرمایا کرتے تھے کہ اوس وقت وہ بلبل ہزار داستان معلوم ہوتے تھے، اُن کی تقریرون کا بھی یہی رنگ تھا، آواز گو پست تھی، مگر تقریر مسلسل اور تاریخی واقعات کے حوالون سے پُر تاثیر ہوتی تھی، اُن کی انشا پردازی کا بھی ایک خاص رنگ تھا، نہایت ستھرا اور پاکیزہ، تکلف سے بری، تصنع سے خالی، اور آورد سے پاک رگون

کے تذکرے ادب سے کرتے تھے، زبان فطرۃً نہایت ادب شناس عنایت ہوئی تھی، لہجہ میں سختی اور آواز میں کرختگی مطلق نہ تھی، گرم سے گرم موقعوں پر بھی وہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے،

بظاہر وہ اخلاق میں بڑے نرم، مرنج و مرنجان تھے، مگر جب کسی وقت کسی چیز پر اڑ جاتے، تو پھر اس سے نہ ٹلتے تھے، چنانچہ حیدرآباد سے علٰحدگی کا سبب یہی پیش آیا، اس پر ایک شعر انھوں نے کہا جو مجھے لکھ بھیجا تھا،

شاہبازِ ہمتم، ربطے بدست شاہ داشت
دست دیگر ترک کردہ در ہوا پرواز کرد

یہ بھی اُن کی سیرت کا قابلِ ذکر واقعہ ہے کہ باوجود ایک رئیس ابنِ رئیس ہونے کے اور حکامِ ضلع سے اچھے تعلقات رکھنے کے سرکاری اعزاز و احترام اور خطاب و القاب سے بچتے تھے، ایک دفعہ اُن کو شمس العلماء کا خطاب ملنے والا تھا، اُن کو خبر ہوئی تو پوری کوشش کی کہ اس خطاب سے اُن کو بری رکھا جائے، فرماتے تھے کہ حیدرآباد کا خطاب اس لئے قبول کیا کہ یہ ایک دولتِ اسلامیہ کی نشانی تھی،

مرحوم کو ملتِ اسلامیہ سے بڑی محبت تھی، اُس کے اچھے واقعات اور مسرت بخش تذکروں سے خوش ہوتے تھے، اور اس کے نفاق و اختلاف کی باتوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے، ندوہ کے باہمی اختلاف کے زمانہ میں باوجود اس کے کہ طرفین دوست تھے، دونوں سے بیگانہ رہے، اور جب مولانا شبلی کی وفات کے بعد مصالحت کا زمانہ آیا تو وہ سب کے آگے تھے،

مرحوم گو سیاست سے سروکار نہیں رکھتے تھے، تاہم ملک کے پچھلے واقعات سے بہت غمگین تھے، عمر کے ساتھ کچھ ملکی اور کچھ خانگی افکار نے بھی اُن کے دل و دماغ کو متاثر کیا، مگر ضابط اور متحمل ایسے تھے کہ کبھی اس داستان کا ایک حرف زبان پر نہیں آیا، ادھر کچھ دنوں میں سب سے پہلے اُن کے حافظہ نے جواب دیا، اکثر بات بھول جاتے، جب کاروانِ خیال نکلا تو اس میں مولانا ابوالکلام کے جواب میں اُن کا یہ بیان پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، کہ ہاں مجھے یاد ہے کہ دو نوجوان غلام محی الدین اور ابوالکلام سفرِ عراق کو نکلے تھے،

تفصیلات اب معلوم ہوئیں، میں نے انھیں لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ سفرِ عراق پر (شاید ۱۹۰۵ء میں) دو نوجوان عراق کے سفر کو نکلے تھے، جن میں سے ایک غلام محی الدین (مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی) تھے، مگر دوسرے ابوالکلام نہیں بلکہ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری تھے، اور اس وقت مولانا ابوالکلام، امرتسر میں وکیل کے ایڈیٹر تھے، بیچارے غلام محی الدین مرحوم نے عراق میں انتقال کیا، ہندوستان خبر آئی، تو مولانا ابوالکلام نے وکیل میں اپنے حزن و غم کا اظہار فرمایا، اخیر میں میں نے لکھا کہ آپ کی اس طرح تصدیق کر دینے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائیگی،

اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی، اور کچھ جواب نہیں دیا، یہ اُن کی خاص عادت تھی کہ جس بات پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے، اس کے جواب سے اعراض کرتے، اسی سے اُن کے ادا شناس اُن کے مطلب کو سمجھ جاتے،

مرحوم کو بزرگوں کی یادگاروں سے والہانہ شیفتگی تھی، پٹنہ کے اجلاس ندوہ میں غالباً حاجی شاہ منور علی دربھنگوی بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ندوہ کے جلسہ میں دستار سر پر باندھ کر آئے جو حضرت حاجی صاحب کا عطیہ اور تبرک تھا، ایک تعلیم یافتہ کی تقریر پر جلسہ میں ایک ایسا پُرعظمت جوش علماء، مشائخ، صلحاء اور عامۂ مسلمین پر طاری ہوا کہ جو جس کے پاس تھا، وہ ندوہ کے نذر کر دیا، شاہ منور علی صاحب نے وہی دستار اُتار کر پھینک دی، وہ دستار نیلام ہو کر بڑی قیمت کو فروخت ہوئی، وہ کون خوش قسمت تھا جس نے آگے بڑھ کر اس کی حسب حیثیت قیمت ادا کی، اور اس کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا، نوجوان حبیب الرحمٰن خان شروانی! پھر اس کو وہ ہمیشہ اپنے لئے طرۂ سعادت سمجھتے رہے،

اُن کے اخیر دور کی یادگاروں میں استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب کی سوانح عمری، اور خطیب بغدادی پر حنفی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہے، جو معارف میں چھپے ہیں، اور الگ بھی شائع ہوئے، انھوں نے

مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کتاب المبین پر ایک تبصرہ لکھا اور میرے پاس بھیجا، اوسی زمانہ مین فقیر کی تصنیف عرب و ہند کے تعلقات چھپی تھی، جی چاہا کہ مرحوم کے قلم سے اس پر کچھ تبصرہ شائع ہوتا، تو مصنف کو فخر و مباہات کا ایک موقع ہاتھ آتا، اس موقع پر اپنے مطلب کو مین نے اس طرح ادا کیا، المبین پر تبصرہ ملا، یاد آیا کہ حضرۃ الاستاذ کی تصنیفات پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہوا کرتا، چنانچہ المامون، الغزالی سوانح مولانا روم اور شعر العجم وغیرہ پر تبصرے پڑھے، کیا حضرۃ الاستاذ کی متروکہ موروثی سعادتون مین سے راقم کو بھی اس سنت دیرینہ کی موروثی سعادت کے حصول کا موقع ملے گا، مرحوم نے بڑی خوشی سے تبصرہ لکھا جو معارف مین شائع ہوا،

مرحوم کی پابندی وضع کی ایک خاص یادگار علی گڈھ مین مولانا سلیمان اشرف صاحب کی قیامگاہ مین اخیر وقت کی حاضری تھی، جو بعد مغرب تک جاری رہتی، جب وہ علی گڈھ آتے، یہ حاضری بلاناغہ ہر موسم مین اور ہمیشہ رہی، اس وقت دلچسپ کُرّا، ان علمی مسائل پر گفتگو رہتی، مولانا سلیمان اشرف صاحب کی وفات کے بعد مولانا مفتی عبد اللطیف کی قیامگاہ پر اوسی وقت، اور اسی حیثیت سے مجلس جاری رہی،

مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، اب اس جوہر شرافت کا نمونہ کبھی دیکھنے مین نہ آئے گا، اب گلستان کا رنگ اور ہے، چار دانگ مین ہوائین اور سمت کی چل رہی ہین، اب ریاست اور ریاست کے ساتھ کمالات و فضائل کا یہ اجتماع گذشتہ تاریخ کا ورق بن کر رہ جائے گا، مگر انشاء اللہ یہ ورق یادگار رہیگا،

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

سیرۃ عائشہ

اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ کے حالات زندگی اور اُن کے مناقب و فضائل و اخلاق اور ان کے علمی کارنامے اور اُن کے اجتہادات اور صنفِ نسوانی پر اُن کے احسانات، اسلام کے متعلق اُن کی نکتہ سنجیان اور معترضین کے جوابات، قیمت: ۔ صر

منیجر

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی علیہ الرحمۃ والغفران

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

اپنی طالب العلمی کے ابتدائی دنون مین اس مبارک و مسعود نام کو پہلی دفعہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ارگن اور مجلہ شہریہ الندوہ کے سرورق پر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا، مولانا شبلی نعمانی کے اسم گرامی کے محاذی یہی نام بالالتزام لکھا جاتا تھا، واقفیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ الندوہ کی ترتیب و ادارت مین مولانا شبلی کے معاون کوئی صاحب ہین، اراجپوتانہ کی دور افتادہ ایک سنگستانی آبادی ٹونک مین قدیم علوم کے ایک طالب العلم کے لئے اس سے زیادہ جاننے کی کوئی صورت بھی نہ تھی، اگرچہ بہت کم لیکن یاد آتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی مضمون بھی مولانا شبلی کے اس ہمدوش و ہم قدم مدیر کے قلم سے اس رسالہ مین نکل جاتا تھا،

مگر کیا معلوم تھا کہ اتنی دور سے جو دکھایا جارہا ہے، اسی کے ساتھ قرب و نزدیکی کا ایسا مقام زندگی مین میسر آئے گا، جسے اب بھی جب سوچتا ہون تو "ظلِ پدر" یا "پدری شفقت" کے سوا تشبیہ کے لئے کوئی دوسری تعبیر سمجھ مین نہین آتی، آہ! ؎

ع قفا نبک من ذکری حبیب ومنزل

تقادیر کی گردشون نے ٹونک سے دیوبند اور دیوبند سے حیدرآباد پہنچا یا، ٹھیک ان ہی دنون مین پہنچا جب مرحوم ہی کے محاورے مین ان ہی کی کمان سب سے زیادہ چڑھی ہوئی تھی، نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان استاذ السلطان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی وجہ سے حکومت آصفیہ کی جد

قائم کردہ وزارت (معین المہامی) مذہبی کی جگہ خالی ہوگئی، ملک کے طول و عرض پر نظریں دوڑائی گئیں،
اور طے کیا گیا کہ اس عہدے کے شایانِ شان بہمہ صفت موصوف ہستی کی ذات والاصفات ہے، جو بھیکم پور ضلع
علی گڈھ کی ریاست کے ایک طرف رئیس بھی تھے، اور سیدنا استاذ العلماء مولانا لطف اللہ علی گڈھی سابق
مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے ممتاز تلامذہ میں بھی شمار ہوتے تھے، قلم بھی اُن کے ہاتھ میں تھا اور زبان بھی
گل افشانیوں، دُرباریوں میں اپنی آپ نظیر تھی، شکوہ شاہانہ، دل فقیرانہ،

الغرض حکومتِ آصفیہ کے وزیرِ مذہبی کے لئے جن خصوصیتوں کی ضرورت تھی ایسا پایا گیا کہ

ع جامہ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود

اباً عن جدٍ پشتہا پشت سے جسکے یہاں نوکر رکھنے کا دستور چلا آرہا تھا، اسی کو شاہ دکن نے اپنی
نوکری کی دعوت دی، مرحوم اس شاہانہ دعوت کے تاثرات کا ذکر خود فرمایا کرتے تھے "ٹلغرافی پیام حیدرآباد
سے اُن کے نام وصول ہوا، فرماتے تھے کہ بجز اس بات کے کہ کسی قسم کی دینی خدمت چاہی جاتی ہے کہ مجھ سے
لی جائے، اور اس جگہ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا، یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس عہدہ کا سرکاری نام کیا ہے، تار
میں غالباً ناظم امور مذہبی کا لفظ کسی طرح داخل کر دیا گیا تھا، ناظم کا حیدرآباد کی سرکاری زبان میں کیا
ترجمہ ہے، کس قسم کی ذمہ داریاں اُس کے سپرد ہوتی ہیں، اور اختیارات جو ملتے ہیں، ان کی نوعیت کیا
ہوتی ہے، سب سے ناواقف تھے، تار ملا، بیان فرماتے تھے کہ سینہ پر تار رکھا ہوا تھا، خوابگاہ کے پلنگ پر
لوٹ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے نوکری کا تو کبھی خطرہ بھی قلب پر نہ گذرا تھا، خاندانی روایات اس کے
متعلق منافی ہیں، ضرورت بھی بحمد اللہ نہ تھی، پھر خواہ مخواہ کی ذمہ داریوں کو اپنے سر کیوں لوں؟ ہجوم
خیالات کا ایک سلسلہ تھا کہ آتا تھا اور جاتا تھا، دوسری طرف خیال گذرتا تھا کہ سرزمین ہند کی سب سے
بڑی اسلامی ریاست کے فرمانروا کا حکم ہے، ان کے حکم سے سرتابی بلا وجہ کیوں کی جائے اچانک فرماتے
تھے کہ اپنے خیال کی آنکھوں کے سامنے پانے لگا کہ حشر کا میدان قائم ہے لوگ بلائے جا رہے ہیں

میری باری بھی آئی ہے، پوچھا جاتا ہے کہ

"میرے دین کی خدمت کا ایک موقع تیرے سامنے آیا تھا، کیا جواب ہے کہ اس موقع سے
تو نے اعراض کیا، صرف اپنی تن آسانی کے لئے اعراض کیا"

اسی کے بعد جو مقدر تھا وہ فیصلہ بن کر سینے میں جلوہ گر ہوا، لبیک کے ساتھ تار کا جواب تار ہی سے غالباً دیا
گیا، اور جب وعدہ حیدرآباد پہنچ گئے، لفظ "ناظم" کی وجہ سے شروع میں مغالطہ کی کچھ صورت بھی پیش آئی، مگر
بارگاہِ خسروی سے جب تصریح ہوگئی، کہ "صدر الصدور ممالک محروسہ سرکار عالی" اس منصب کا سرکاری نام
ہوگا جس کی دعوت دی گئی تھی، تو مغالطے کا جو بادل پھیلایا گیا تھا، پھٹ کر صاف ہوگیا، "ناظم امور مذہبی"
کا عہدہ اُن کے تحت کر دیا گیا، جب تک صدر الصدوری کے منصب جلیل پر وہ سرفراز رہے، نواب اختر یار
جنگ مولوی لطیف احمد مینائی مرحوم فرزند امیر مینائی مرحوم اُن کے محکمہ کے ناظم اور بعد کو معتمد بھی ہوگئے،

نواب موید الملک سر علی امام مرحوم نے جب "بابِ حکومت" کے نام سے کابینہ کی تنظیم کی، تو بابِ حکومت
کے صدر کا نام صدر اعظم اور ارکین کابینہ صدر المہام کے نام سے موسوم ہوئے، صدر الصدور کی حیثیت اس کے
بعد کیا ہوئی، اسے کیا بتایا جائے اسی سے قصہ شروع ہوا اور اسی پر ختم بھی ہوگیا،[1]

---

[1] قیام بابِ حکومت کے بعد زیادہ منتظم شکل میں اور اس سے پہلے بھی حکومتِ آصفیہ کے ہر محکمہ کا ایک ناظم (ڈائرکٹر) ہوتا اور
ناظم کے اوپر معتمد (سکریٹری) ہوتا تھا جو کسی معتمدی کسی وزیر کے تحت کام کرتی تھی، جب تک بابِ حکومت قائم نہ
ہوا تھا، وزیر اعظم کا نام مدار المہام اور اس کے رفقائے کار وزرا کو معین المہام کہتے تھے، بابِ حکومت جب
قائم ہوا، تو کابینہ کے ہر رکن کا نام صدر المہام رکھا گیا، سوال پیدا ہوا کہ محکمہ امور مذہبی میں صدر الصدور
کی حیثیت کیا ہوگی، سر علی امام مرحوم نے ذاتی طور پر باور کرایا تھا، کہ صدر الصدور کی حیثیت شیخ الاسلام
کی رہے گی، جس کا رتبہ صدر اعظم اور وزرائے کابینہ سے بھی بلند تر ہے، اسی لئے شروانی صاحب کو بابِ حکومت
کا رکن نہیں بنایا گیا، اور محکمہ مذہبی کی نمائندگی کے لئے بابِ حکومت کے کسی وزیر کے دوسرے صیغوں کے ساتھ

خیر مین کن باتون مین مشغول ہوگیا، عرض یہ کر رہا تھا کہ تقدیر نے حیدرآباد جب پہنچایا، تو اس وقت حیدرآباد کی دینی و علمی سرگرمیون کا مرکز وحید شروانی صاحب کی ذات والاصفات بنی ہوئی تھی، طالب العلمی کا زمانہ تو ختم ہو چکا تھا لیکن طالب العلمی کے بعد والی زندگی صحیح معنون مین چونکہ شروع نہین ہوئی تھی، اس لئے سن و سال وضع و قطع ہر لحاظ سے عربی مدرسہ کے ایک طالب العلم سے زیادہ میری کوئی حقیقت نہ تھی، تھوڑی دیر کے لئے صرف ایک سرسری ملاقات کا موقع ملا تھا، لیکن در اصل نیازمندی کے صحیح تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے، جب دوسری دفعہ در دولت پر فقیر حاضر ہوا تھا، ایک انگریز کی کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی، اسی مین مقیم تھے، وہ اندر ملاقات کے سجے ہوئے کمرے مین تشریف فرما تھے، سامنے چلمن پڑی ہوئی تھی، باہر برآمدے مین کرسیون پر میری طرح اور بھی مختلف طبقات کے لوگ ملنے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے، ان مین اونچے نیچے سرکاری غیر سرکاری ہر طرح ہی کے لوگ تھے، ایک کرسی پر فقیر بھی اسی جھمیلے مین بیٹھ گیا، صرف ہلکی سی سرسری ملاقات جس مین صورت کی شناخت بھی دوسرون کے لئے دشوار ہوتی ہے، مگر سنئے اُن کی نظر چلمن کی تیلیون سے باہر آکر جو بیٹھے ہوئے تھے، ان پر پڑتی ہے، اور ایک بھاری بھرکم آواز میرے کانون مین اندر سے آتی ہے :-

"مولوی صاحب! آپ کی جگہ وہ نہین ہے، آپ بے تکلف اندر چلے آیا کیجئے"

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ خطاب کس سے ہے لیکن خیال آتا ہے کہ پھر شاید نام لے کر اس حیرت کا ازالہ فرما دیا گیا، اور آپ کا خاص خادم محبوب مرحوم باہر آیا، بولا کہ نواب صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہین، حاضر ہو گیا، پاس

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۷) اس صیغہ کی نمایندگی بھی ختم کر دی گئی، ابتدا مین اس عجیب و غریب پیچیدہ صورت حال کا اثر واقعات پر نہ پڑا، لیکن شروانی صاحب کی حیدرآباد سے واپسی سچ پوچھئے تو اسی ابتدائی مغالطہ کا نتیجہ تھی جس کی تفصیل اب غیر ضروری ہے، "تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت و لکم ما کسبتم یغفر اللہ لنا و لہم اجمعین" (۱۲)

بٹھایا اور مزاج پرسی کے بعد پھر اسی پدرانہ شفقت و عطوفت کے ساتھ فرمانے لگے کہ

"آپ کے لئے اجازت وغیرہ کے تقصون کی ضرورت نہین، جب آنا ہو بے تکلف چلمن اٹھا کر اندر چلے آیا کیجئے"

غیر معمولی مہربانی سے تعلق کی ابتدا ہوئی، اسی عرصہ مین حضرۃ الاستاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی مین خاکسار اورنگ آباد اور خلدآباد کی سیر کے لئے روانہ ہوا، شروانی صاحب بھی شاہی فرمان کی بنیاد پر ضلع اورنگ آباد کے کسی بڑے جاگیردار کے مقدمہ کے تصفیہ کے لئے اورنگ آباد ہی مین قیام فرما تھے، خلدآباد بھی سیر کے لئے گئے ہوئے تھے، خلدآباد کی مقدس پہاڑی پر سب کا اجتماع تھا، اسی اجتماع مین استاذ مرحوم نے شروانی صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مین علی گڈھ (اعظم گڈھ) جا رہا ہون خاکسار کا نام لیکر فرمایا کہ انکو بطور امانت آپکے سپرد کرتا ہون، مسکراتے ہوئے شروانی صاحب نے فرمایا کہ آپکی یہ امانت میرے پاس محفوظ رہیگی، حضرۃ الاستاذ تو وہین سے اعظم گڈھ کے ارادے سے روانہ ہوگئے اور فقیر کو قربت کی سعادت پہلی دفعہ نواب صاحب مرحوم کے ساتھ میسر آئی، پہاڑی سے اُتر کر اورنگ آباد جب واپس ہوئے تو اب خاکسار شروانی صاحب کے ساتھ اورنگ آباد کے دار الامارہ مین مقیم تھا، حکم دیا گیا کہ شہر مین گھوم گھوم کر قلمی کتابون کا پتہ چلاؤن، یہ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا، نواب صاحب کے منشا کو پا کر اپنے اپنے کتب خانے کی سیر کی اجازت ہر ایک نے دی، اس سفر مین بعض نادر مخطوطات کا سرمایہ اکٹھا ہوا، دس پندرہ دن بعد نواب صاحب کی معیت مین حیدرآباد واپسی ہوئی، اورنگ آباد ہی مین فقیر بھی اُن سے مانوس ہو گیا، اور اُن کے لطف و کرم کی موسلادھار بارشون کا سلسلہ اس کے بعد جو شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنون تک برستا ہی رہا، امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کر دیا، فرحمہ اللہ و نور ضریحہ،

کم و بیش تقریباً بارہ سال کی طویل مدت اُن کے زیر سایہ حیدرآباد کی زندگی گذری، اس عرصہ مین سرکاری غیر سرکاری شعبون مین اُن کے کارنامون کی فہرست اتنی طویل ہے جس کی پوری تفصیل کے لئے ضخیم جلد بھی غالباً کافی نہ ہو، یہان سرسری طور پر بعض نمایان خدمات کا جو یاد آتے جاتے ہین تذکرہ کرنا چاہتا ہون

جس وقت نواب صاحب علیہ الرحمۃ والغفران حیدرآباد تشریف لائے تھے، میلادی مجلسوں کا حیدرآباد مین جو رواج تھا، ان مین عموماً یہی دیکھا جاتا تھا کہ حضرمی عرب جن کے ساتھ کچھ مقامی پیشہ ور میلاد خوان لوگ بھی شریک تھے، اپنی مختلف پارٹیان بنائے ہوئے تھے، میلاد پڑھانے والے ان ہی میلادی ٹولیون مین سے کسی ٹولی کو دعوت دیدیتے، ٹولی میلاد پڑھنے والون کی اس کے گھر پر کچھ رات گذرے پہونچ جاتی، اور چیخ چیخ کر تین تین چار چار آدمی زیادہ تر اردو جس کے ساتھ فارسی اور عربی اشعار بھی ہوتے، ایک خاص لہجہ مین پڑھتے رہتے، تا آنکہ صبح ہو جاتی، گھر کے لوگ اطمینان کے ساتھ سو رہتے، اور میلاد خوانو کی یہ ٹولی جاگ کر رات بسر کرتی، صبح کو معینہ فیس لے کر چلی جاتی تھی، شروع شروع مین حیدرآباد کے مسلمانون کے گھرون سے میلاد خوانی کی یہ آواز جب میرے کانون تک پہونچی تو مدت تک سمجھتا رہا کہ کہین بھجن گایا جا رہا ہے، کچھ ایسے لب و لہجہ مین لوگ اردو اشعار کو بھی پڑھتے تھے، کہ الفاظ سمجھ مین نہین آتے تھے کہنے والے پیشہ ور میلاد خوانون کی ان ٹولیون کے متعلق طرح طرح کی باتین منسوب کرتے ہین، واللہ اعلم بالصواب لیکن سنی سنائی باتون سے قطع نظر کر لینے کے بعد وہان کی میلاد خوانی کی عام حالت وہی تھی جو بیان کی گئی،

لیکن نواب صاحب مرحوم نے میلادی مجلسون کا ایک نیا نظام قائم کیا، قائم کیا کیا، اندرونی طور پر دلون مین تقاضا تو اصلاح کا پہلے ہی سے تھا، لیکن اصلاحی اقدامات مین عملی شرکت کے لئے کوئی آمادہ نہین ہوتا تھا، نواب صاحب نے اس کا خیال کئے بغیر کہ ان کے منصب جلیل کا اقتضا کیا ہے ہر اس شخص کے گھر پہنچنے پر راضی ہو گئے، جو ان سے میلاد پڑھوانا چاہتا ہو، سیرت طیبہ کے متعلق اُن کا مطالعہ کافی وسیع اور عمیق تھا، بیان و خطاب کا طریقہ بھی حد سے زیادہ متین و سنجیدہ معلومات اُن کے کھرے ہوتے تحقیقی ہوتے تھے، جس نے بھی بلایا اپنی موٹر پر اس کے گھر پہنچ گئے، اور گھنٹہ دو گھنٹے "سیرت طیبہ" کے مختلف پہلوؤن پر مسلسل پر مغز، موثر تقریر فرماتے، رفتہ رفتہ لوگون کا مذاق بدلنے لگا، اور بجائے انفرادی مجلسون کے اجتماعی مجلسون کے انعقاد کا ذوق پھیلنے لگا، اس کے بعد کیا ہوا، یہ آٹھ دس سال حیدرآباد کے واقعہ یہ ہے کہ بھلائے نہین جا سکتے،

جلسہ مین شریک ہونے والون کی تعداد ہزار ہا ہزار تک پہونچ جاتی تھی، مبالغہ نہ ہوگا اگر میلاد کی بعض اجتماعی مجلسون کے سامعین کی تعداد کا تخمینہ پچاس ساٹھ ہزار تک کرون، سکندرآباد کی میلاد کی مجلس نے اس سلسلہ مین پہلا نمونہ قائم کیا، پھر تو حیدرآباد کے مشہور محلون اور بستیون مین شاید ہی کوئی محلہ اور کوئی بستی ایسی باقی رہ گئی، جس مین سکندرآبادی مجلس کے معیار تک جلسہ کے نظم و انتظام فرش و فروش، جھاڑ فانوس وغیرہ کو نہ پہنچا دیا گیا ہو، خود نواب صاحب اس عرصہ مین بیان کرنے سے کبھی تھکے

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اُن کی تقریرون کے سننے والون مین تھکے جانے کی کیفیت ہی کبھی محسوس نہین ہوئی، وہ کہتے جاتے تھے، اور لوگ سنتے جاتے تھے، حالانکہ اُن کی تقریرین موضوع جعلی حدیثون جھوٹے تراشیدہ افسانون، بلکہ شعر و نغمہ کی دلچسپیون سے قطعی طور پر پاک ہوتی تھین، بیان کا طرز بھی سادہ سیدھا، روان ہوتا تھا، مگر قرآنی آیتون سے نکالے ہوئے صحیح نتائج معتبر حدیثون اور سیرت کے تاریخی مستند واقعات ہی مین اتنی غیر معمولی دل آویزی پیدا ہو جاتی تھی، کہ مشکل ہی سے حیدرآباد کی پبلک دوسرون کی تقریر یا وعظ سننے کے لئے آمادہ ہوتی تھی، رئیس آدمی تھے، راحت و آرام کی زندگی کے قدرۃً عادی تھے، لیکن میلادی مجلسون کے لئے نہ وقت کا سوال اُن کے لئے باقی رہتا تھا، اور نہ موقع اور محل کا، رات کے بجے بارہ بجے تک کبھی دلچسپی ہوتی لیکن مین نے کبھی ان کی زبان پر کسی قسم کی گرانی کی شکایت نہین پائی،[1]

---

[1] خاکسار بھی ان میلادی مجالس مین اپنی بساط کے مطابق تھوڑا بہت حصہ تقریباً لیا کرتا تھا، ایک دفعہ کثرت مجالس سے جو تقریری بار پڑتا تھا، اس کا ذکر ذرا گرانی کے ساتھ کرنے لگا، فرمانے لگے، مولوی صاحب کس کی مجلس ہے، آپ کے ٹخنون سے تو خون جاری نہین ہوا، اور آپ کے دانت نہین توڑے گئے، ابھی سے گھبرا اٹھے شرم سے گردن جھک گئی،

غلط عقائد بے بنیاد اوہام، جاہلی رسوم و رواج، ہر ایک چیز کی اصلاح بھی اُن کی عالمانہ تقریرون
سے ہوتی چلی جاتی تھی، لیکن مجھے یاد نہیں ہو کہ کسی کو کسی زمانہ مین اُن کی تقریر کے کسی فقرے سے کبھی شکایت
پیدا ہوئی ہو، اور فتنہ و فساد کا برپا ہونا تو دور کی بات تھی، وہ سب کچھ کہتے تھے، سب کچھ سناتے تھے
جو کچھ کہتے اور جو کچھ سناتے تھے، سچ ہوتا تھا لیکن تلخی اُن کے بیان سے کبھی پیدا نہین ہوئی، فہمایش کا طریقہ
قطعاً غیر معمولی تھا جس کی نظیر اپنے تجربہ مین تو نہین ملی، دیوبندیت، بریلویت، ندویت، نیچریت، وہابیت
وغیرہ وغیرہ عصری اختلافات کے سلسلہ مین حالانکہ ہر مسئلہ کے متعلق فیصلہ کن رائے رکھتے تھے، اور اپنے
فیصلون پر اُن کو کافی اصرار تھا، تقریرون مین وہ اپنے فیصلون کے حدود سے سر مو متجاوز نہ ہوتے
تھے، مگر یہ طرز بیان کی خوبی تھی کہ مخالف خیال رکھنے والون مین بھی ان کی باتون سے کسی قسم کی گرانی
پیدا ہوتی تھی، اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ مسلمانون کے ان مختلف جتھون کے افراد کے قلوب مین
غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ اُن کے متعلق پایا جاتا تھا، اس راہ مین تو یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی دائرون
مین بھی اُن کی ہر دلعزیزی کا کافی وزن تھا، "امور مذہبی" کا شعبہ حکومت آصفیہ کا ایسا شعبہ ہے جس کے
احاطے مین مسلمانون کے مساجد و مقابر اور دوسرے مآثر کے ساتھ ہندوؤن، عیسائیون، پارسیون کے
مذہبی و دینی مقامات کی نگرانی بھی داخل ہے، اسی وجہ سے ہر ملت و مذہب کے نمایندے اُن کی خدمت
مین حاضر ہوتے، اپنے درد دکھ کے قصے سناتے، ہر ایک کی بات سنتے، اور حسنِ سلوک کا ایسا نمونہ پیش
فرماتے، کہ ہر ایک آپ کا مداح ہو کر واپس ہوتا، کم از کم اس بارہ سال مین مین نے تو کسی دین و ملت کے
پیرو کو آپ کے شاکی نہ پایا، حالانکہ اپنی اسلامی و دینی زندگی مین اُن کا اصرار تصلب کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا،
مگر اُن کی زندگی کے مختلف شعبے اپنے اپنے حدود مین اس خوبی کے ساتھ محدود تھے، کہ غلط مبحث کی صورت
ہی کبھی پیش نہ آتی تھی، شروانی صاحب اس باب مین غیر معمولی کردار کے حامل تھے، اُن کی زندگی کا یہ
پہلو بڑی تفصیل کا طالب ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف سیدنا مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ

اور اُن کے خلفاء و جانشینون کے ساتھ ایسے تعلقات قائم تھے کہ گویا ان ہی صاحبدل درویشون مین ایک
بڑے درویش وہ بھی ہین، دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی و مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آزاد خیال بزرگون
سے اُن کی راہ و رسم لوگون کے لئے باعثِ حیرت کبھی بن جاتی ہے، مگر ان مختلف الجہات بلکہ متضاد تعلقات
کے نباہنے اور حسن و خوبی کے ساتھ نباہنے کا غیر معمولی سلیقہ قدرت کی طرف سے اُن کو عطا ہوا تھا، ہر ایک مین
فضل و کمال کا جو حصہ پایا جاتا تھا، حد سے زیادہ فراخ چشمی کے ساتھ اس کا اعتراف اُن کی عجیب و غریب
خصوصیت تھی، ایک ہی مجلس مین اُن سے آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا حبیب الرحمن مرحوم مہتمم دیوبند
کی تعریف بھی سن سکتے تھے، اور اسی کے ساتھ مولوی احمد رضا خان بریلوی مین جو علمی اور عملی خوبیان ان کے
علم مین پائی جاتی تھین، اُن کا بھی ذکر فرماتے، ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی امہات الامۃ کی مجلس تحریق کے متعلق کہا
جاتا ہے کہ ایک رکن وہ بھی تھے، اور اس آتشین مجلس کی پھبتی اڑانے والے مولوی عبد الحق صاحب بابائے اردو
سے بھی اُن کی دوستی تھی،

حیدرآباد جس زمانہ مین فقیر پہونچایا گیا تھا عثمانیہ یونیورسٹی اس وقت تک قائم نہین ہوئی تھی، چرچا
البتہ اس کے قیام کا پھیلا ہوا تھا، سب سے بڑی رکاوٹ جیسا کہ خاکسار نے سنا ہے نواب فضیلت جنگ
مولانا انوار اللہ خان مرحوم کی طرف سے پیش آ رہی تھی، کہتے ہین کہ جامعہ کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا، اسکو
دیکھ کر مولانا مرحوم نے فرمایا تھا کہ ملک کی آمدنی مین اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتون سے کوئی مدد نہین ملے گی
بلکہ مصارف بڑھا دیئے جائین گے، اور الحاد و بے دینی کے جراثیم جن سے حیدرآباد ایک حد تک محفوظ ہے عوام
مین پھیل جائین گے، حضرت آصف جاہ سابع پر مولانا انوار اللہ خان مرحوم کا غیر معمولی اثر تھا، نتیجہ یہ ہوا
مولوی صاحب کی مخالفت راہ کا روڑا یونیورسٹی کے حق مین بن گئی تھی، نیچے سے اوپر اتنی طاقت کسی مین
نہ تھی جو اس روڑے کو ہٹائے، اُن کی وفات کے بعد جب شروانی صاحب اُن کی جگہ مامور ہوئے تو اعلیٰ
حضرت نے فرمان صادر کیا، کہ یونیورسٹی کے متعلق جتنے کاغذات بھی ہون وہ صدر الصدور کے توسط در معائنہ

کے بعد پیش ہوں،

شروانی صاحب نے اس سلسلہ میں بلیغ کوشش کی، اور مولانا فوادا للہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا اثر سرکار دولتمدار کے قلب پر جو تھا، اس کے ازالہ میں کامیاب ہوئے، یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا، اور پہلے وائس چانسلر اس یونیورسٹی کے شروانی صاحب فرمانِ مبارک کی رو سے مقرر ہوئے،

ابتدا میں تو ان لوگوں کو جو جدید یونیورسٹی کا خواب دیکھ رہے تھے، بڑی خوشی ہوئی، وہ کلیۃً مشرق میں مغرب کا کھیل کھیلنا چاہتے تھے، سمجھتے تھے کہ شروانی صاحب روشن خیال آدمی ہیں، اس کھیل کی مرن اجازت ہی نہ دیں گے، بلکہ ایکٹ میں حصہ بھی لیں گے، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ،

چارٹر تو منظور ہوگیا، چارٹر ہی میں شروانی صاحب نے یہ بھی منظور کرالیا کہ مغربی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات اور اسلامی اخلاق وجذبات کی نشو ونما کا کام بھی اس جامعہ سے لیا جائے گا، سمجھا گیا تھا کہ یہ رسمی الفاظ ہیں عمل کے وقت ان الفاظ کو بے اثر کرکے رکھ دیا جائے گا،

یونیورسٹی کے اوقات مختلف شعبے اور ہر شعبہ کا درجہ وار ہی نصاب جب بننے لگا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب شروانی صاحب نے علاوہ شعبۂ دینیات کے (جو مرحوم دار العلوم کالج) کا جانشین، اور اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کا مستقل ادارہ تھا، اس کے سوا بھی اُن کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ ہر مسلمان طالب العلم کو ابتدائی تعلیم سے بی اے تک ایک مستقل مضمون "دینیات" کا بھی لزوماً لینا پڑے گا، ان کو سنا لطہ دیا جاتا تھا کہ مضمون کی حیثیت سے نصاب میں دینیات کا نام بھی لکھ دیا جائے گا، مطالبہ کے لئے کچھ کتابوں کی سفارش بھی کردی جائے گی، لیکن یونیورسٹی کے کلاسوں میں اس کی تعلیم نہیں دی جاسکتی، خدا خدا کرکے تعلیم دلانے پر لوگ جب راضی ہوئے تو کہا گیا کہ اس مضمون میں طلبہ کا امتحان نہ ہوگا، مگر شروانی صاحب ڈٹے رہے کہ تعلیم بھی ہوگی اور امتحان بھی ہوگا، وقت ہی ایسا تھا کہ آخر سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا، لیکن ظاہر ہے کہ ایک جبری عنصر جو پہلی دفعہ ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کے نصاب میں باہر سے بزور داخل کرادیا

گیا تھا، اسی لئے دباؤ کے ہٹنے کے ساتھ ہی وہ باہر نکل پڑا جو نہیں جانتے ہیں وہ اس کو حکومت کے سکولر نظریہ کا کوئی جدید نتیجہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم نظریہ کا یہ قدیم نتیجہ تھا جس کا ظہور اب ہوا ہے،

دوسرا اہم معرکہ اسی جامعہ کے تعلق میں جو پیش آیا، وہ شعبۂ دینیات کے اساتذہ کی تنخواہ کا مسئلہ تھا، کہا جاتا تھا کہ بازار میں جن علوم کے پڑھانے والوں کی جو قیمت ہے، اس سے زیادہ قیمت یونیورسٹی بھی ان کی کیوں ادا کرے، لیکن نواب مرحوم کے اصرار نے اس مسئلہ کو بھی طے کرا چھوڑا، وہ اس کو گوارا نہیں کرسکتے تھے کہ جامعہ کے حدود میں داخل کرکے اسلامی علوم کی اہانت کی جائے،

اس کا ل ایک جگ یا قرن میں اور ادر کیا کیا نقشے پیش آئے، انھیں کہاں تک بیان کروں، قدم قدم پر روڑے تھے، ٹھوکریں تھیں، مگر غایت بے جگری اور دلیری کے ساتھ وہ آخر وقت تک زمانہ کی اس آندھی کا مقابلہ کرتے رہے، جو ہر موقع پر اُن کے قدم کا رُخ بدل دینا چاہتی تھی،

بعض دفعہ دلچسپ لطائف بھی اس سلسلہ میں پیش آتے، ایک دفعہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کے یہاں ڈنر پر دوسرے حکام کے ساتھ مدعو ہوئے، انگریزی ڈنر میں جیسا کہ دستور ہے منجملہ دوسرے التزاموں کے ضروری ہے کہ نشست دو جنسی ہو یعنی مرد کی ایک کرسی کے ساتھ دوسری کرسی جنس لطیف کے کسی فرد کی رکھی جاتی ہے، شاید نشستگاہ کی اس خصوصیت سے پہلے وہ واقف نہ تھے، ورنہ شرکت ہی سے عذر کردیتے، مگر شریک ہوجانے کے بعد کیا کرتے، بقول امام ابوحنیفہ ابتلیت بہ فصبرت، انھوں نے بھی صبر سے کام لیا، فرماتے تھے، کوئی میم صاحبہ دوسری کرسی پر اُن کے ساتھ بیٹھی تھیں، پوچھنے لگیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی کیا اس ڈنر میں شریک ہیں "نہیں" کا جواب سن کر میم صاحبہ نے پر لطف فقرہ یہ فرمایا کہ

"اپنی بیویوں کو آپ لوگ کیا اپنی ذات کے لئے مختص سمجھتے ہیں"

انگریزی زبان کا فقرہ تھا شاید اس کا ترجمہ یہی ہوسکتا ہے ہنس کر چپ ہو رہے، بعد کو بار بار اس فقرے کو دہراتے اور مسکراتے کہ میم صاحب نے عجیب بات پوچھی،

کبھی کبھی جامعہ کے بعض علمی مقالات خصوصاً اسلامیات سے جن کا تعلق ہوتا، ان کے ملاحظہ کے لئے بھی بھیج دیئے جاتے تھے۔

ایک دفعہ حجاج بن یوسف مشہور ظالمِ امت کی مداحی میں ایک مقالہ ایک خاص نقطۂ نظر کے پروفیسر صاحب کی نگرانی میں کسی طالب العلم نے پیش کیا، پروفیسر کی طلبی ہوئی، اور مذہبی نہیں بلکہ علمی حیثیت سے جو مواخذے اُن کی طرف سے پیش ہوئے وہ بڑے دل چسپ تھے،

خود فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی حلقوں کے متعلق اس قسم کی خبریں مجھ تک بسا اوقات پہنچائی جاتی ہیں کہ "نیرو مائنڈ" کا عیب اس شخص میں پایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ اپنے بچے کھچے ایمان کی سند میں تو اسی کو سمجھتا ہوں

مگر ایک پہلو اُن کی زندگی کا اگر یہ تھا تو دوسری طرف ایک دفعہ نہیں بیسیوں مواقع پر تجربہ ہوا کہ قدیم خیال کے پرانے مولویوں کا کسی مسئلہ پر شدید اصرار ہے، لیکن اُن کے اصرار سے قطعاً متاثر نہ ہوتے، اور اپنے نزدیک جو بات دین کی روح کے مطابق ہوتی، اسی پر عمل کرتے، جامعہ عثمانیہ ہی کے شعبۂ دینیات کی انگریزی کا مسئلہ چھڑا، قصہ یہ تھا کہ گو اس شعبہ میں بھی انگریزی کا ادب کی تعلیم طلبہ کے لئے ضروری تھی، مگر آرٹس اور سائنس کے طلبہ کے مقابلہ میں معیار اُن کے نصاب کا پست تھا، نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی پڑھنے میں شعبۂ دینیات کے طلبہ کا وقت بھی صرف ہوتا تھا، لیکن انگریزی زبان سے جیسی کہ چاہئے مناسبت بھی پیدا نہیں ہوتی تھی، نیز سرکاری دفاتر میں بھی یہ کہتے ہوئے کہ انگریزی آپ لوگوں کو نہیں آتی اس شعبہ کے طیلسانی (گریجویٹ) واپس کر دیئے جاتے تھے، خاکسار کی طرف سے تحریک شروع ہوئی، کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی فنون و سائنس کے مساوی کر دی جائے، بلکہ انگریزی ادب کی تعلیم و امتحان تینوں شعبوں کی چاہئے کہ مشترک ہو، قدیم طرز کے علماء جن کی تعداد اس وقت شعبہ کے اسٹاف میں غالب تھی، اس ترمیم سے چراغ پا تھے، ناقص معیار کی انگریزی ہی سے وہ نالاں تھے، مساوی معیار کی تجویز جس حد تک ان کو برہم کر سکتی تھی، ظاہر ہے مگر نواب صاحب مرحوم نے دل سے آخر تک اسی پر زور دیا کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی دوسرے شعبوں کے مساوی کر دی جائے، بالآخر اسی کو ٹھکرا کے رہے، اس ترمیم کے نتائج غیر معمولی نکلے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے،

قدامت و جدت کا امتزاج اُن کے اندر کچھ عجیب غریب طریقہ سے ہوا تھا، ایک طرف کوٹھی کے پائیں باغ میں ورد و وظائف و تلاوت میں بھی مشغول پائے جاتے، اور صبح کے اوراد سے فارغ ہونے کے بعد چائے کی میز پر بالالتزام کسی انگریزی روزنامہ کے مطالعہ میں مشغولیت بھی اُن کی عام عادت تھی، مسرف تو وہ نہیں تھے، لیکن کریم النفس، فیاض، امیر، باذل ہونے میں بھی شک نہ تھا، حیدرآباد میں اُن کو دو ہزار ماہوار کے ساتھ الاونس کی بھی کافی رقم ملتی تھی، لیکن جہاں تک خبر جاتا ہے گھر سے بھی حیدرآباد کے مصارف کی تکمیل کے لئے بسا اوقات منگوانے کی ضرورت پیش آجاتی تھی، اُن کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، مشکل ہی سے کوئی ضرورت مند اُن کے آستانے سے محروم واپس ہوتا تھا، ہر سال شب دیگ کی دعوتوں کا سلسلہ موسم سرما میں مہینوں جاری رہتا، ہر شب میں ایک ایک ٹولی ہم مذاقوں کی مدعو ہوتی، آج بھی اُن کی شب دیگی دعوتوں کا ذکر کام و دہن میں یاروں کے ہلچل پیدا کر دیتا ہے،

میں اس سلسلہ میں دوسروں کا ذکر کیا کروں ملازمت کے ابتدائی سالوں میں مجھ پر ایک سخت مرض کا حملہ ہوا، وطن ہی میں تھا، میں تو بیہوش پڑا ہوا تھا، میرے منجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی سلمۂ نے شروانی صاحب کو صرف میرے بیمار پڑ جانے اور مرض کی جو کیفیت تھی، اس سے مطلع کیا، جواب میں صرف استمزاج کا خط ہی نہیں آیا، بلکہ منی آرڈر کے ذریعہ شاید ڈھائی تین سو کی رقم بھی ارسال فرمائی گئی، خط میں میرے بھائی کو انھوں نے لکھا تھا کہ مولوی صاحب کے علاج میں مصارف کا خیال نہ کرنا، جتنے روپیے کی ضرورت ہو مجھ سے منگواتے رہنا، اگرچہ زیادہ منگوانے کی ضرورت بحمداللہ نہ ہوئی، لیکن اُن کے اس شریفانہ برتاؤ کی یاد دل میں جب کبھی آجاتی ہے، چشم پر آب ہو جاتا ہوں، اب ایسے بے غرض حسن سلوک کرنے والے بزرگوں کو دنیا کے اس پردے پر ہم کہاں پائیں گے،

سچ تو یہ ہے کہ علاوہ ان عام مادی منافع کے اُن کی صحبت و رفاقت میں خدا ہی جانتا ہے کہ شعوری و غیر شعوری طور پر کتنے علمی و اخلاقی جواہر پارے میرے دل و دماغ میں رچ گئے، انھوں نے انسانی زندگی

کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، عام ہنگاموں سے آزاد ہو کر سوچنے کے عادی تھے، یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ دینی و اسلامی علوم کے جاننے والوں کی بے قدریوں کا عام دکھڑا اُن کے سامنے جیسا کہ اس زمانہ مین دستور ہے دہرا رہا تھا، سنتے رہے، پھر فرمایا کہ مولوی صاحب! آپکے دینی و اسلامی علوم کے ماہرین کا کیا آج ہی یہ حال ہے، آپکے امام ابو حنیفہ جیل مین کب گئے تھے، اور امام احمد بن حنبل پر تازیانے کیا کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے لگائے گئے تھے، امام بخاری کو جلا وطنی کی سزا کیا ان ہی دنون مین بھگتنی نہین پڑی تھی، جب دنیا پر مسلمانون ہی کا سیاسی اقتدار قائم تھا، سمجھاتے کہ آپ کے بزرگون نے کام کرنے کی شرط کبھی یہ نہین رکھی تھی کہ پہلے حکومت قائم ہولے، مولویون کے لئے بڑے بڑے عہدون اور مناصب کے دروازے کھل جائین، تب کام کرین گے، اس دن کچھ ایسے انداز مین تقریر فرمائی کہ اپنے اندر بلا مبالغہ عرض کرتا ہون مین نے ایک کلی انقلاب محسوس کیا، مسلمانون کے سیاسی اقتدار کے زوال کو دین و علم کی بے قدری کا سبب قرار دینے کا جو دل عادی تھا، اس کا نقطۂ نظر ہی بدل گیا،

حیدر آباد کی مسجد چوک مین حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی یاد مین ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، شروانی صاحب نے اس جلسہ مین تقریر کی، واقعہ یہ ہے کہ اس تقریر سے پہلے حضرت مجددؒ کے خدمات کی صحیح قیمت کا مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا، مجدد سے پہلے مغلون کے تخت پر اکبر و جہانگیر، اور مجددؒ کے بعد شاہجہان و عالمگیر ان کی تقریر کا اساسی عنوان تھا، پھر مین کیا بتاؤن کہ اس سلسلہ مین انھون نے معلومات کے کن خزانون کو وقف عام فرمایا، بعد کو حضرت مجدد الف ثانی پر فقیر نے جو مقالہ لکھا اور کافی مقبول ہوا، مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صحیح نقطۂ نظر اگر نواب مرحوم سے نہ ملتا، تو اس مقالے کے لکھنے مین کبھی کامیاب نہ ہوتا،

ان کی خانگی مجلسیں بھی علم و ادب کی مجلسین تھین، معلومات کا غیر معمولی ذخیرہ اُن کے سینے مین محفوظ تھا، مطالعہ ان کا غیر معمولی طور پر وسیع تھا، گویا مین تو یہ سمجھتا ہون کہ سبقاً سبقاً کسی کتاب کے پڑھنے کا موقع تو ان سے مجھے نہین ملا لیکن کسی شاگرد کو اپنے استاذ سے جو فوائد پہنچتے ہین، مجھے اس پر فخر ہے

اُن سے یہ منافع مجھے حاصل ہوئے، اور بہت زیادہ حاصل ہوئے تفصیل کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے،

وہ بڑے صاف ستھرے اجلی زندگی کے عادی تھے، جامہ زیبی مین مشکل ہی سے حیدر آباد مین کوئی دوسرا آدمی اُن کا مدمقابل بن سکتا تھا، ان کی موٹر بھی سب سے اچھی اور قیمتی موٹر ہوتی تھی، کوٹھی بھی ان کی سول لائن سوا جی گوڑہ کی کوٹھیون مین ممتاز تھی، زندگی کے اکثر شعبون مین ان کا یہی حال تھا، بعضون مین اُن کے اس طرزِ عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی، مگر یہ جو کچھ تھا، صرف ظاہر مین تھا، باطن مین اُن کے کچھ نہ تھا، خیال آتا ہے کہ سفر حج کا عزم جب فرما لیا گیا، تو فقیر کو علی گڈھ طلب کیا گیا، پہونچا، حکم ہوا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بعض زندہ بزرگون سے بھی ملنا چاہتا ہون، اور اپنے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی کے مزار فائض الانوار پر بھی حاضری کا قصد ہے، جی چاہتا ہے کہ کم از کم اس سفر مین تو تم میرے ساتھ رہو، بسر و چشم قبول کیا گیا، منجملہ دوسرے مقامات کے فیض آباد بھی پہونچے، یہان حضرت مولینا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا شاہ نیاز احمد رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے، ان کا قیام کویلو کے چھپر کے نیچے تھا، جس کے سامنے مٹی کا ایک چبوترہ میدان مین تھا، جس پر بوریا بھی پڑا نہ تھا، گرد سے بھرا ہوا تھا، بیٹھنے کی جگہ اس کے سوا تھی بھی نہین، اور شاہ صاحب نے حیدر آباد کے وزیر مذہب کو اسی چبوترے پر بیٹھ جانے کا اشارہ بھی فرمایا، بے تکلف مین نے محسوس کیا کہ بغیر کسی جھجک کے بکشادہ پیشانی وہ اس چبوترے پر اپنی قیمتی شروانی کے ساتھ بیٹھ گئے، پھر شاہ صاحب مرحوم سے دعا کی درخواست کی، اس عجیب و غریب دعا کے الفاظ آج بھی حافظے کے نہان خانہ مین گونج رہے ہین، شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھایا، اُن کے ساتھ ہم لوگون کے ہاتھ بھی اٹھ گئے، پھر فرمانے لگے:-

"بار الہا! یہ حبیب الرحمن خان شروانی تیرا ایک ناچیز بندہ ہے،

بار الہا! جب اس پر ناگزیر وقت آجائے، سانس اکھڑ رہی ہو، تو اس کی امداد فرمائی جائے،

بار الہا! جب کفن پہنا کر اس کے تابوت کو لے چلین تو اپنی رحمت کا سایہ اس پر ڈال، اُجھ

گور کے خلوت خانہ میں حبیب الرحمٰن خان کو لوگ رکھ کر واپس آجائیں اور غریب وہان تنہا رہ جائے تو اپنی رحمت اپنے کرم سے روشنی پیدا فرما، قوت بخش کہ نکیرین کے سوال و جواب میں یہ بیچارہ ثابت قدم رہے؛"

بار الٰہا! جب حشر کا میدان قائم ہو، اور بڑے چھوٹے پتنگوں کی طرح ادھر ادھر مارے پھرتے ہوں، تو اس بیچارے حبیب الرحمٰن بھیکم پور والے کی دستگیری فرما، اس کے گناہوں کو بخش دے، بجائے جہنم کے اس کو تیرے فرشتے جنت کی طرف لیجائیں؛"

بیس سال سے زیادہ مدت کی بات ہے، یہ دعویٰ تو مشکل ہے کہ یہی بجنسہٖ اُن کے الفاظ تھے لیکن بہت سے الفاظ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے اس میں محفوظ ہیں، شاہ صاحب نے اور بھی کیا کیا فرمایا، اب یاد نہیں، نواب علیہ الرحمۃ والغفران کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی، سارا مجمع مجسّم گریہ و بکا بنا ہوا تھا، آخر میں فرمایا کہ

"اے اللہ اس غریب پر اس کے حج و زیارت کے سفر کو آسان فرما؛"

کیا معلوم تھا کہ بیس سال پہلے جن ضرورتوں کی تصویر مردِ عاقبت بین کے سامنے تھی، وہ ہم سب کے سامنے بھی آجائے گی، اُن پر اُن کا ناگزیر وقت آگیا، اب وہ تنہا اس عالم میں ہیں جہان نہ اُن کے اعزہ ہیں، نہ اقربا، نہ احباب ہیں، اور نہ دوست، نئی دنیا ہے، نئے رفقا ہوں گے، نئے حالات ہوں گے، آدمی خواب میں بھی پاتا ہے کہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ گیا، اور بیداری کی دنیا کے واقعات سے بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے، کون کہہ سکتا ہے، اپنے حقیقی مرقد (خوابگاہ) میں کچھ یہی صورت اُن لوگوں کے سامنے پیش آتی ہے جو اس دنیا والوں سے تو الگ ہو جاتے ہیں، لیکن نئی دنیا میں نئی ولادت اُن کی ہوتی ہے؛

فاللّٰھُمَّ اغفر لہٗ وارحمہٗ کن اللّٰھُمَّ انیسہ واجعل لہ من الملائکۃ والانبیاء والاولیاء رفیقا،

قلم ہاتھ میں آگیا ہے قصداً اس کو اگر نہیں روکتا ہوں تو یہ بہکتا ہی چلا جائے گا، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن کچھ کہہ نہ سکا امرؤ القیس کے قصیدے کا ابتدائی شعر ہے

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحومل

بار بار زبان پر آجاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی کے لئے کل یہ شعر عرب جاہلی کے اس شاعر سے کہلوایا گیا تھا، آخر میں اُن ہی کے فرمودہ چند اشعار پر اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہوں،

مجلس مذاکراتِ علمیہ اُن ہی کی سرپرستی میں ایک علمی مجلس قائم تھی، جس میں شہر کے ممتاز اہلِ علم و ادب جن کا علوم کے مختلف شعبوں سے تعلق تھا، اس مجلس کے ارکان تھے، اسی مجلس میں اپنی زبانِ مبارک سے اردو کی یہ غزل سنائی تھی، اس کا کیف و اثر دل پر اس وقت تک باقی ہے، "تیری" کی خطابی ضمیر کسی کو مخاطب بنا کر یہ غزل انھوں نے کہی تھی، دل اس خطاب کے رخ کو آج کل خود غزل کہنے والے کی طرف کر کے بسا اوقات گنگناتا ہے، فرمایا تھا،

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس میں بو تیری	خوشا وہ دشت کہ ہو جس میں جستجو تیری
رہین صحنِ گلستان نہیں دل افزائی	شمیم لطف دل افزا ہے کو بکو تیری

اس "کو بکو" سے ذہن اُس مقام کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے جہان آج کل یہ فقیر کچھ دنوں سے مقیم ہے، انھوں نے بہار کے اس دور افتادہ کوردہ گیلانی کو بھی ایک دفعہ اپنی تشریف فرمائی سے سرفراز فرمایا تھا، اسی کا خیال آجاتا ہے اور پھر زبان پر اسی غزل کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے،

ہنوز دشتِ ختن نافہ زارِ عالم ہے

کبھی کھلی تھی ادھر زلفِ مشکبو تیری

آخر کے دو شعر یہ تھے :-

فرشتۂ اجل آئے پری کے قالب مین

بوقتِ مرگ جو صورت[1] ہو روبرو تیری

امید تو یہی ہے کہ انشاء اللہ ان کی یہ آخری آرزو پوری ہوئی ہوگی، دوسرا شعر جو مقطع بھی تھا،

خیالِ لطف سے حسرت ہے باغ رضوان مین

سنا ہے جب سے کہ لطف و کرم ہے خو تیری

اب اُن کا "شنیدہ" انشاء اللہ الملک الکریم الجواد "دیدہ" بن چکا ہوگا، فتغمدہ اللہ بغفرانہ وطاب ثراہ؛

---

[1] بخاری شریف کی روایت ہے کہ مرنے والون سے پہلی بات پوچھی جاتی ہے کہ ما تقول فی ھذہ الرجل (اس آدمی کے متعلق تم کیا کہتے ہو) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، مقطع سارا ساز و سامان اسی بشارت مین پوشیدہ ہے،

نوائے حیات

طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحابِ ذوق پوری طرح واقف ہین، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ کر اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت :- ۲۱۴ صفحے، قیمت :- عہ

"منیجر"

نفثۃ المصدور

از جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی

حکم ہوا ہے کہ جو تعلقات میرے، اور مولانا شروانی مرحوم کے درمیان تھے، ان کی بنیاد پر مین معارف کے صدر یار جنگ نمبر کے لیے ان کی علمی زندگی کے کسی پہلو پر کچھ لکھ کر دون، اس کی تعمیل ناگزیر ہے، اول تو جو خلوص مجکو خود ان کے ساتھ تھا، اس کی بنا پر، دوسرے وہ نظر شفقت و کرم جو ان کی میرے حال پر تھی دونون ہی اس کی متقاضی ہین، تیسری چیز یہ بھی ہے کہ کرم فرماؤن کی بات رد نہین کی جاسکتی، چنانچہ جو کچھ ہوسکتا ہے مختصراً حاضر کرتا ہون، مگر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے جذبات کا تاثر میری تحریر مین بہت نمایان ہوگا، اور بجائے مخصوص پہلو کے میری تحریر مین عموم نظر آئے گا، امید ہے کہ یہ دونون بے اعتدالیان بنظر درگذر دیکھی جائین گی، کیونکہ مین اپنی افتادِ طبیعت سے مجبور ہون، اور اسی وجہ سے عنوان تحریر وہ ہے جو اوپر نظر آرہا ہے،

آغاز واقفیت جن دنون مین استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین پڑھتا تھا، مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی حضرت کے آستانے پر حاضر ہوتے رہا کرتے تھے، اول اول میرا سبق حضرت کی خدمت مین ظہر کی نماز کے بعد مقرر ہوا تھا، لیکن چند ہی روز بعد مولوی کرم الٰہی صاحب مرحوم کے دو سبقون مین سے ایک مین مجھے شرکت کا حکم ملکر صبح کے وقت بھی میری حاضری لازمی قرار پا گئی، شروانی صاحب استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین کبھی کبھی ایسے وقت آتے کہ میرا سبق ہو رہا ہوتا یا فوراً ہوچکا ہوتا، الغرض مجکو ان کے متعلق اس طور پر معلوم ہوگیا تھا کہ وہ ایک رئیس ہین اور میرے استاد کے عقیدتمند شاگرد، وہ مجھکو اس سے زیادہ نہ

جانتے ہون گے کہ کوئی طالب علم ہے، جو استفادہ کر رہا ہے، اور استاد ایسے شفیق ہین کہ معذوری کی حالت مین بھی اس کو پڑھا رہے ہین، اس دوران مین کبھی ایسا بھی ہوا کہ حضرت نے میرے قلم سے کوئی خط مولوی حبیب الرحمن خان صاحب کو لکھوایا، کیونکہ جیسا کہ مین کلام لطف کے مقدمہ مین لکھ چکا ہون، یہ سعادت مجھکو حاصل تھی کہ حضرت اپنے خطوط اکثر میرے ہی قلم سے لکھوایا کرتے، اس دور کے خاتمے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، کہ استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد جب شروانی صاحب پہلی بار استاذ کے آستانے پر حاضر ہوے تو مین نے خود دیکھا کہ جس مکان مین حضرتؒ کا قیام تھا، اس کی ڈیوڑھی مین کھڑے ہو کر بیساختہ رونے لگے، اور اس قدر بے قابو ہو گئے کہ رونے مین آواز بلند ہو گئی، اس دور کے بعد کوئی خاص تعلق ملاقات یا خط و کتابت کا نواب صاحب مرحوم کے اور میرے درمیان نہ تھا، تا آنکہ میرا تعلق لائبریری اور یونیورسٹی سے پیدا ہوا، اور کسی علمی ضرورت سے کبھی مین نے کوئی خط لکھا یا کسی بات پر توجہ دلائی تو اس کے جواب سے مجھکو مشرف کیا، عرصہ کے بعد ایک بسیط مقالہ استاذ العلماءؒ کے سوانح حیات کا معارف مین شائع فرمایا جو بعد مین بصورت رسالہ علیحدہ بھی نکلا، اس مین میرا ذکر اس خصوصیت کے ساتھ آیا کہ حضرت نے علمی شغف کی وجہ سے معذوری کی حالت مین مجھکو تعلیم دی، اور اس سلسلے مین ایک مخصوص جملہ میرے متعلق فرمایا، جسکو مین اسی رسالے سے کلام لطف کے مقدمہ مین نقل کر چکا ہون، اور اپنی سعادت کے لیے پھر دُہراتا ہون،

"میان مولوی بدر الدین جب پڑھنے آجاتے ہین تو مین اپنی تکلیفین بھول جاتا ہون اور جبتک ان کو پڑھاتا رہتا ہون ہائے ہائے سے نجات مل جاتی ہے"،

میری پہلی ملاقات شروانی صاحب سے علی گڈھ مین ان کے جائے قیام پر اس وقت ہوئی جب مین شرح المختار پر کام کر رہا تھا، جس وقت مین پہنچا، سر راس مسعود مرحوم تشریف رکھتے تھے، ان کو رخصت کر کے میرا کام دیکھا اور بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا، میری یہ ملاقات بے غرض تھی، اس لیے خلوص کا اثر ظاہر ہوا، گو کہ میرا سلسلۂ آمد و رفت قائم نہین ہوا، تاہم جب اور جہان ملاقات ہوتی، بہت شفقت

زمانے، اسی زمانہ مین اورینٹل کانفرنس کا جلسہ لاہور مین تھا، نواب صاحب بحیثیت صدر شعبۂ اردو تشریف لے گئے تھے، اور مین انٹرمیڈیٹ کالج کے نمایندے کے طور پر شریک ہوا تھا، کانفرنس کے عصرانہ مین ملاقات ہوئی، دیر تک متوجہ ہو کر مجھسے باتین کرتے رہے، اور مغرب کا وقت ہو جانے پر مجھے آگے بڑھا کر نماز پڑھی،

تعلقات مین استحکام

غرض خلوص اپنا اثر دکھاتا رہا، مین جب شہر کی سکونت چھوڑ کر یونیورسٹی کے احاطے مین قیام پذیر ہوا، تو اس کی اطلاع پانے پر مجھکو تحریر فرمایا "یونیورسٹی مین قیام مبارک ہو"، اس احاطے مین مقیم ہو کر مین نے اپنے مذاق کی صرف ایک ہی جگہ پائی جو مولوی سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی قیام گاہ تھی، مولوی صاحب میرے والد مرحوم کے استاد بھائی تھے، یونیورسٹی سے میرا تعلق ہو جانے کے بعد اکثر میری آمد و رفت ان کے یہان ہونے لگی تھی، اب پڑوس مین آکر روزانہ عصر و مغرب کے درمیان مین نے وہان حاضری کا معمول مقرر کر لیا، یہ سلسلہ بھی بے غرض اور خلوص سے تھا، پختہ ہوتا چلا گیا، مولوی صاحب میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے جیسا ایک بزرگ خورد کے ساتھ کرتا ہے، آمدم بر سر مطلب۔ نواب صدر یار جنگ مرحوم کی عادت تھی کہ جتنے دن بھی علی گڈھ مین قیام رہتا، روزانہ مغرب کے قریب مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہان تشریف لاتے، علمی و دینی مسائل، بزرگون کے تذکرے اور تاریخی واقعات موضوع سخن رہتے، مولوی سلیمان اشرف صاحب نے نشست کی یہ ترتیب قائم کی تھی کہ ایک جانب خود، بیچ مین نواب صاحب اور دوسرے پہلو پر مین، بعد مین یہی ترتیب مفتی عبد اللطیف صاحب کے یہان اور حبیب منزل مین بھی قائم رہی کہ وسط مین نواب صاحب ایک پہلو پر مفتی صاحب اور دوسرے پہلو پر مین،

استاد سے عشق

نواب صاحب مرحوم کے ذاتی اوصاف کا آغاز مین اس عنوان سے کر رہا ہوں جو مجھکو بھی بہت محبوب ہے، شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو جس مین استاد کا ذکر نہ ہو، استاذ العلماءؒ کی شاگردی پر ناز تھا، درس کے واقعات، تلامذہ کے تذکرے، استاد کے علمی کمالات بہت لطف سے بیان فرماتے، میرے متعلق حضرت کا فرمایا ہوا جملہ جو اوپر نقل ہو چکا، حرف بحرف یاد تھا، مجھکو دیکھکر حاضرین مجلس کے سامنے

اکثر اس جملہ کا اعادہ فرماتے، سنتا تھا کہ میری غیبت مین بھی استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر مین یہ جملہ زبان پر لاتے،

حبیب گنج اور علی گڈھ کے درمیان ایک ایسی جگہ پڑتی ہے جہان سے پلکھنہ کو راہ جاتی ہے، پلکھنہ استاذ العلماء کا مولد اور آبائی وطن تھا، جب ادھر سے گذر ہوتا فرماتے تھے کہ استاد سے تعلق پلکھنہ کی طرف جاذب توجہ ہو جاتا، وہان تقریبات مین شریک ہونا اور علما کے مجمعون کا سمان نگاہ کے سامنے آجاتا، ادھر آخر مین کئی بار اس مقام پر پہنچکر ایک ایک دو دو شعر بھی برجستہ موزون ہو جاتے تھے، جو کبھی حبیب گنج سے بذریعہ ڈاک میرے پاس بھیجدیتے کبھی بروقت ملاقات زبانی سناتے یا کسی پرچہ پر لکھکر مجھے دیتے، اس وقت میرے پاس چار تحریرین موجود ہین، جنکو مین یہان نقل کرنا موزون سمجھتا ہون،

(۱) ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ اثنائے سفر علی گڈھ محاذی پلکھنہ

پلکھنہ وہ ہے نور شمس معارف — کیا جس نے پر نور عالم سراسر

پلکھنہ دیا فیض دنیا کو جس نے — لکھا نام اس کا ہے اوج فلک پر

"دنیا" پر نشان لگا کر نیچے یہ عبارت تحریر ہے، "مبالغہ نہین، ایک بار جناب مولانا مرحوم کے یہان تقریب شادی مین علماء کا مجمع حسب معمول تھا، ذکر چلا سرحدی درسگاہون کا، ایک عالم سرحد نے کہا کہ ایک بار ایک اہل علم کے جلسے مین صوبہ سرحد کے ان مدارس کو شمار کیا جو مولانا کے تلامذہ، اور تلامذہ کے تلامذہ کے جاری تھے، تو تین سو شمار مین آئے، اگر فی مدرسہ پچاس طالب علم اقل قرار رکھے جائین تو پندرہ ہزار ہوئے، اب مبالغہ کی گنجائش کہان ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہ فیض کب سے جاری تھا آج بھی بفضلہ تعالیٰ جاری ہوگا،

(۲) بذریعہ پوسٹ کارڈ "ابھی علی گڈھ سے آکر اترا ہون، فیض پلکھنہ فی البداہتہ

پلکھنے کا ہو وصف، کب ہے یہ امکان — یہان گرم تھی بزم ارباب عرفان

وہ ارباب عرفان جو تھے جان عالم — وہ محبوب عالم وہ جانان عالم

۲ نومبر ۱۹۴۷ء

(۳) پلکھنہ وہ معمور لطف لدنی — منور ہے عالم تجلی سے جس کی

(۴) پلکھنے مین برسے ہین انوار حکمت — درخشان وہان پر ہے نور تجلی

مرشد سے عقیدت مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت تھی پورے خاندان کے اندر یہ سعادت صرف نواب صاحب مرحوم کو اور ان کے چچازاد بھائی خلیل الرحمن خان صاحب کو حاصل ہوئی، ورنہ خاندان کے تمام زن و مرد شاہ جہانپور کے شاہ عبدالغفور صاحب سے بیعت تھے، بہت عقیدت سے فرماتے کہ خاندان مین کبھی کسی کا نام رحمان پر نہین ہوا تھا، مولانا کی یہ کشش نام رکھتے وقت ہی ظاہر ہوئی کہ ہم دونون ان سے بیعت ہونے والے حبیب الرحمن اور خلیل الرحمن کے نامون سے موسوم ہوئے، مولانا کے واقعات اور انکے ارشادات سے شاید ہی کوئی مجلس خالی ہوتی ہو، پہلی بار جب گنج مرادآباد کی حاضری ہوئی تو مولانا نے دریافت فرمایا "مولوی لطف اللہ کو جانتے ہو"، عرض کیا "جانتا ہون"، فرمایا "خدمت کرتے ہو"، عرض کیا "بزرگ خدمت کرتے ہین"، اس واقعہ کا ذکر بہت خوبی کے ساتھ اکثر معمول تھا، فرماتے کہ خوش نصیبی تھی مولانا لطف اللہ صاحب سے پڑھا اور مولانا فضل الرحمن صاحب سے بیعت کی، آخر مین استاد کی جو خدمت نصیب ہوئی اس کو بھی مرشد کے سوال کا نتیجہ خیال کرتے تھے،

میرے ساتھ شفقت بزرگانہ جیسا کہ مین لکھ چکا ہون، میرے تعلق کا آغاز بہت معمولی طریقہ پر ہوا، مگر بعد مین اتنا مستحکم ہوگیا کہ احاطۂ تحریر مین لانا ممکن نہین، استحکام کی دو وجہین معلوم ہوتی ہین، پہلی جو آغاز مین کارفرما تھی علمی اور ادبی یکجہتی اور ہمخیالی، اس مقام پر بتا دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ بڑے آدمیون اور حکام سے دور رہنا مجھ کو ہمیشہ سے محبوب رہا ہے، لیکن نواب صاحب مرحوم کی درویشانہ صفت، علم دوستی اور خود ان کی کشش نے مجھکو ان سے قریب کر دیا، دوسری وجہ میرا خصوصی تعلق استاذ العلماء رحمۃ اللہ کی خدمت مین، اب تو نواب صاحب مرحوم کا تعلق میرے ساتھ مستحکم ہو جانے کا یہ عالم تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر تمھاری کوئی بات ہوتی ہے تو مولانا کی صورت سامنے آجاتی ہے، مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان

کرتا ہوں، میرے یہاں تقریب تھی عین وقت پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب حبیب گنج جا رہے ہیں شریک نہ ہوں گے، میں فوراً پہنچا، اور عرض کیا کہ شرکت کے بعد تشریف لے جائیں، تھوڑے سے تامل کے بعد فرمایا بہت اچھا، شرکت کی، پھر حبیب گنج گئے، دوسری بار جب تشریف لائے، تو مخصوص جلسہ میں مبتلا کہ جب میں روکنے کے لیے پہنچا تو مولانا کی صورت سامنے آگئی، پھر یہ تاب، کہاں تھی کہ شرکت نہ کرتے.
اپنی تالیفات بہت اہتمام کے ساتھ مجھکو عطا فرماتے، سال گذشتہ جب فارسی کا دیوان چھپ کر آیا تو اسکا ایک نسخہ اپنے دست مبارک سے حسب ذیل عبارت لکھ کر مجھ کو دیا،

"ہدیہ مولف خدمت زبدۃ العلما مولوی بدر الدین بدر سمار کمال مدفضلہ

حبیب الرحمن صدر یار جنگ، ۲۵ شعبان المعظم ۱۳۶۸ھ"

اہل علم سے محبت اور علمی بنا پر تعلقات اہل علم سے بہت رغبت تھی، محض علمی فضل کی بنا پر لوگوں سے تعلقات پیدا کرتے، اہل علم پر احسانات کرتے، جس کے پس پردہ بجز علم پروری کے کوئی اور غایت نہ ہوتی، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی وائس چانسلری کے زمانہ میں اچھے اچھے علما کو یونیورسٹی میں جمع کر لیا، اہل علم کے ساتھ ہم نشینی کا خاص ذوق تھا جس کا ایک مظہر یہ تھا کہ مولوی سلیمان اشرف صاحب اور مفتی عبد اللطیف صاحب کے یہاں روزانہ پابندی کے ساتھ تشریف لا کر گھنٹوں بیٹھتے، نواب صاحب مرحوم کی یہ مجلسیں بڑی پاکیزہ ہوتی تھیں، جن میں معلوم ہوتا تھا کہ اہل مجلس دنیا اور مافیہا سے بلند تر کسی اور عالم کے لوگ ہیں، خالص دینی، علمی اور تاریخی مضامین پر گفتگو رہتی تھی، یہاں یہ بتانا مناسب ہے کہ سارے ملک کے مشاہیر اہل علم و کمال سے پختہ تعلقات تھے جن کا ظہور خصوصیت سے سفر کے موقعوں پر ہوتا تھا، مثلاً ایک واقعہ لکھنؤ کے بابت بیان کرتا ہے، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی اور مولانا عین القضاۃ صاحب کے پاس جانا لکھنؤ پہنچ کر لازم تھا، ایک بار وہاں کوئی دربار تھا، نواب مزمل اللہ خان صاحب کی رفاقت تھی، ایک ہی جگہ دونوں صاحب مقیم ہوئے، دوسرے دن صبح کو ضروریات سے فارغ ہو کر حسب معمول شروانی صاحب مولانا نعیم صاحب وغیرہ کے یہاں گئے

اور نواب مزمل اللہ خان صاحب، حکام سے ملے، جائے قیام پر واپسی کے بعد جب ملاقات ہوئی، تو نواب مزمل اللہ خان صاحب نے جو چچیرے چچا زاد بھائی اور عمر میں بڑے تھے، ذرا تیز ہو کر پوچھا "کہاں چلے گئے تھے" جواب سننے پر انھوں نے پھر تیز ہو کر کہا کہ "ان لوگوں سے ملنے آئے ہو یا دربار کے لیے" اس کا جواب یہ تھا "کیا کیا جائے ایک خبط ہے" اسی طرح ایک بار مزمل اللہ خان صاحب نے گرم ہو کر کہا کہ "یہ کیا واہیات ہے کہ روزانہ جہاں شام ہوئی مولوی سلیمان اشرف کے یہاں"، اس کا بھی جواب یہی تھا کہ "خبط ہے" یہاں ایک واقعہ اور لکھنے کے قابل ہے، یونیورسٹی میں کوئی تقریب تھی، لائبریری میں ممبران کورٹ اور ممبران اسٹاف اپنی اپنی مقررہ جگہ پر آ کر بیٹھتے جا رہے تھے، اسٹاف کے سلسلہ میں میں بھی آکر ایک طرف بیٹھ گیا تھا کہ نواب صدر یار جنگ مرحوم لائبریری کے دروازہ پر آکر رکے، ادھر ادھر نظر ڈالی اور مجھ کو دیکھ کر میرے پاس تشریف لے آئے، اور اسکا کچھ خیال نہ فرمایا کہ وہاں ان کی جگہ نہ تھی، جب تک لائبریری میں اجتماع رہا، میرے ہی پاس تشریف فرما رہے اور برابر باتیں کرتے رہے،

درویشی اور تواضع باوجود خاندانی خوش حال ہونے کے مزاج میں درویشی اور فروتنی تھی جس کے بکثرت مناظر ہر شخص نے دیکھے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اہل علم سے بے تکلف محبت کرنا شان درویشی ہی کا نتیجہ تھا، اپنے خاص واقعات، بیان فرماتے، مگر اس طور پر کہ ہر گز کبھی کبر و نخوت ظاہر نہ ہوتا، بلکہ فروتنی کے انداز سے بیان کرتے،

وضعداری اور پختگی نہایت وضعدار تھے، جس سے جو رسم قائم ہو گئی بہت پختگی کے ساتھ اس پر عمل رکھا، اختلاف خیال اور اختلاف مذاق ہرگز اس رسم میں کمزوری پیدا نہ کر سکا، شاید ہی کوئی شخص شناساؤں میں ایسا ہو جس کے خیال میں اس کی مثالیں نہ ہوں، وضعداری کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب تک قوت رہی بہ پابندی قیام علی گڈھ روزانہ عصر کے بعد مفتی عبد اللطیف صاحب کے یہاں جو معمول آنے کا تھا اس میں کبھی ناغہ نہ ہوتا، اس مضبوطی کو دیکھئے کہ اگر مفتی صاحب علی گڈھ میں نہ ہوتے تو بھی حسب معمول تشریف لاتے، ان کی آمد

کی وجہ سے دوسرے اہل مجلس حاضر ہوجاتے، ایک بار ایسے ہی موقع پر مجھ سے فرمایا:

ومن مذھبی حب الدیار لاھلھا　　وللناس فیما یعشقون مذاھب

یہ بھی فرماتے کہ اس وقت کہیں اور کا خیال بھی نہیں آتا، آخر میں جب کمزور ہو گئے، تو یہ معمول قرار پایا کہ عصر کے بعد مفتی صاحب کو اور مجھ کو لینے کے لیے ہمارے قیام گاہوں پر گاڑی آتی، اگر کبھی مفتی صاحب کسی وجہ سے نہ جا سکتے تو تنہا میں جاتا، بیشتر تشریف آوری کا معمول اسی پختگی کے ساتھ مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہاں مقرر تھا، غرض پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات تھی پتھر کی لکیر کے مانند کسی کی طاقت نہ تھی کہ ذرا سی بھی جنبش دے سکے،

دینداری اور ضبط اوقات بھیکم پور عرصہ سے دینداری کا مرکز تھا، اور اسی ماحول کے اثر سے نواب صاحب مرحوم میں بھی دینداری بدرجۂ اتم تھی، دینداری کا ایک جز ضبط اوقات ہے، وہ بھی بہت نمایاں تھا، نماز باجماعت کے لیے مسجد میں جانا اور ورد و وظائف میں مشغول رہنا سفر تک میں نہ چھوٹتا، علی گڈھ کے قیام میں مغرب کی نماز لازمی طور پر جماعت سے ہوتی، پہلے مفتی صاحب کے مکان پر اور بعد میں حبیب منزل میں جماعت سے فارغ ہو کر بے ساختہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتے، نماز کی امامت مفتی صاحب کیا کرتے، مگر اب کئی سال سے یہ بار گراں مجھ کو سپرد ہو گیا تھا،

حیدرآباد کی صدر الصدوری دینی خدمت ہی کے خیال سے منظور کی تھی، فرماتے تھے کہ طبیعت گریزاں تھی، مگر بالآخر خدمت اسلام کا پہلو غالب آیا، چنانچہ وہاں کے دوران قیام میں بکثرت اصلاحیں کیں، بدعات کو توڑ کر صحیح اسلامی اور مسنون طریقے رائج کیے، ــــ سچی دینداری ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کے یہاں غیبت کا گذر دور دور نہ تھا،

علمی ذوق نواب صاحب مرحوم کو علم کا بے حد ذوق تھا، تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ایک خوش حال گھر میں پیدا ہو کر پوست ماحول سے جدا گانہ مذاق ان کے اندر پیدا ہوا، ان کے چچا عبد الشکور خان صاحب اپنے اور بھائیوں میں ضرور ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے کہ خود ذی علم اور درویشانہ زندگی بسر کرتے، لیکن

اس کے ساتھ ہی ایک اور نمونہ خود ان کے والد محمد تقی خاں صاحب کا بالکل رئیسانہ تھا، نواب صاحب مرحوم نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے چچا کے حکم سے عربی پڑھی، اور اچھے اساتذہ کے فیض صحبت سے علم کی طرف مکمل رجحان پیدا کیا،

کتب خانہ اسی رجحان کا نتیجہ دو صورتوں میں ظاہر ہوا، جن میں سے ایک یہ ہے کہ نوادر کو فراہم کر کے کتبخانہ قائم کیا، کتب خانہ کے آغاز کا بیان جیسا کہ خود فرمایا کرتے تھے، بہت دلچسپ ہے، اور "مقالات شروانی" میں معارف سے منقول ہو کر درج ہے،

"ان کے لڑکپن میں ایک کتب فروش بچوں کی کتابیں بیچنے آیا کرتے تھے، ان کو دیکھ کر کتابیں فروخت کرنے کا شوق ہوا، رات کو زنانخانہ میں یہ کھیل ہوتا کہ کسی چادر یا کپڑے کی گٹھری بنا کر کتابیں بیچا کرتے، بیبیاں اس کھیل کو دیکھ کر ہنستیں اور تعجب کرتیں، بچپن میں کتابیں بیچنے کا شوق آئندہ کتابیں خریدنے میں تبدیل ہو گیا، پہلے اردو دیوانوں کے نسخے خریدے، جو صندوقوں میں پلنگ کے پاس رکھے تھے، بعد کو الماری کا انتظام ہوا، انگریزی تعلیم کے لیے آگرہ گئے، وہاں قلمی کتابیں خریدنے کا شوق ہوا، جو علامہ شبلی سے تعلقات ہونے کے بعد شغف کے درجے پر پہنچ گیا، چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے سفروں میں قلمی کتابوں کی فراہمی کا خاص خیال رہتا تھا، حیدرآباد میں بھی بڑا ذخیرہ نایاب کتابوں کا فراہم ہوا، جن میں ایک نسخہ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ کا خود مصنف شیخ عبد الحق دہلوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس طرح برابر کوشش کے ساتھ نایاب کتابوں کی بلکہ نایاب چیزوں کی فراہمی جاری رہی، شوق کی وجہ سے بعض اوقات خرچ بھی کافی کرنا پڑا، نتیجہ یہ ہے کہ محض کتابیں ہی نہیں ہر قسم کے نوادر جمع کر لیے، جن کے دیکھنے کے لیے غیر ممالک کے لوگ بھی آتے ہیں، کتبخانہ کی چند خاص باتیں قابل ذکر ہیں، کوئی نادر کتاب یا چیز ناجائز طریقہ پر حاصل نہیں کی، جتنی کتابیں فراہم کیں سب سے استفادہ کیا، جو شخص کتبخانہ کو دیکھنے کے لیے حبیب گنج آیا خواہ وہ کوئی بھی ہو بہت خوش ہو کر اس کی غیر معمولی خاطر کی،

تصنیف و تالیف علم کی طرف رجحان کی دوسری صورت کا ظہور تصنیف و تالیف سے ہوا، اس کا آغاز بھی

دلچسپ ہے، خود فرماتے تھے کہ ان کی طالب علمی کے زمانہ میں حیدر آباد سے رسالہ "حسن" نکلتا تھا، جو اچھے مضامین پر ایک اشرفی انعام دیتا، چنانچہ بابر پر ایک مضمون لکھ کر بھیجا، جو اب علحدہ بھی چھپ چکا ہے، رسالہ نے اس پر ایک ایک اشرفی انعام دی، اس طریقہ پر لکھنے کا شوق بڑھتا گیا جس کی بدولت بکثرت تصانیف کیں، مضامین لکھے، سارے ملک میں علمی شان کی دھوم مچ گئی، مضامین کا مجموعہ "مقالات شروانی" کے نام سے حال میں شائع ہو چکا ہے، جس کے ۲۰۰ صفحات ہیں، افسوس یہ ہے کہ اس مجموعہ میں المامون پر ریویو نہیں شامل ہو سکا، جو علامہ شبلی مرحوم سے تعلق کا باعث بنا تھا، تصانیف میں سیرۃ الصدیق" انگریزی میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوئی، چھوٹی بڑی مذہبی، تاریخی اور ادبی تصنیفات تیس سے متجاوز ہیں،

دینا اور وقار ملک میں جتنے تعلیمی، علمی اور دینی ادارے قائم ہوئے یا پہلے سے تھے، سب کے ساتھ گہرے تعلقات رکھے، ہمیشہ انکی مالی اعانت کی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری ۳۲ سال تک بالاتفاق منتخب ہوتے رہے، کانفرنس کے جلسوں کے لیے بڑے بڑے لمبے سفر کیے، اور اخراجات خود برداشت کیے، اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑا زبردست وقار ملک میں حاصل ہوا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات اور مشرقی علوم کے رکن رکین سرسید کے زمانہ سے آخر تک رہے، بغیر خواہش یونیورسٹی کورٹ اور اگزیکیٹو کاؤنسل کے ممبر بھی ہوتے رہے،

ادبی ذوق اب میں نواب صاحب مرحوم کے ادبی ذوق کے چند نمونے پیش کرتا ہوں، جس زمانہ میں حبیب منزل زیر تعمیر تھی، میرس روڈ پر حبیب منزل کے سامنے ایک جگہ بتقریب شادی میرا یہ نواب صاحب کا اجتماع ہوا، فراغت کے بعد مجھ سے فرمایا کہ "آؤ ایک چیز تمھارے ذوق کی دکھلاؤں" حبیب منزل لے گئے، اور ایک بڑے پتھر پر جلی اور خوشخط حرفوں میں امرء القیس کا مصرعہ نہایت بلیغ تصرف کے ساتھ یوں کندہ کیا ہوا دکھلایا،

فیاحبذا ذکری حبیب منزل

اس تصرف کو میں نے بیحد پسند کیا، اور متاثر ہو کر بے ساختہ دیر تک پسندیدگی کا اظہار کرتا رہا، میں ان دنوں شہر میں رہتا تھا، تانگہ پر شہر سے آیا تھا، فرمایا "تانگہ رخصت کر دو"، اور خود اپنے ساتھ مجھکو میرے قیامگاہ

کے قریب لاکر اتار گئے، پسندیدگی سے جو تاثر مجھے ہوا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکان پہنچکر چند منٹوں کے غور کے بعد بے اختیارانہ تضمین ہو گئی، جو درج ذیل ہے،

بناء عظیم للحبیب بکوئل — عن النقص والاخلال صار بمغزل

فیبقی علی الآباء ذکری کلیهما — فیاحبذا ذکری حبیب منزل

اسی دن، یا دوسرے دن میں نے اس تضمین کو خط کے ذریعہ خدمت میں پیش کر دیا، جسکا جواب نیچے نقل کرتا ہوں

"مصرعے بلیغ ہیں، کوئل کا قافیہ غنیمت بارد ہے، امرء القیس کے مطلع پر اہل نظر نے یہ ایراد کیا تھا کہ مطلع کا دوسرا مصرعہ بسقط اللوی الخ مصرعہ اولیٰ کے پایہ کا نہیں، آپ کا تیسرا مصرعہ چوتھے سے خوب چسپاں اور ہمپایہ ہے"،

اسی خط میں مولوی حبیب الرحمن خانصاحب کی سفر حج سے واپسی کی عربی تاریخ لکھ کر عنایت فرمائی جو بغیر نام کے محض تاریخ پر مشتمل تھی، میں نے اس پر عربی میں مصرعے لگا کر ان کا نام اور یہ کہ ان کے والد ماجد نے تاریخ کہی ہے نظم میں ظاہر کر دیا، اس پر بھی خوشی کا اظہار مندرجہ ذیل کلمات میں فرمایا،

"عربی تاریخ پر مصرعے صاف اور برمحل لگ گئے، کمی پوری ہو گئی، اہل کمال کے فیض سے نقص بھی کمال حاصل کر لیتا ہے"،

بعض بعض جملے نواب صاحب مرحوم کی تحریروں میں انتہا درجے کے بلیغ ہیں، مثلاً خزینۃ المعانی کے مقدمہ میں اپنی تعلیم اور اساتذہ کے مختصر ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہیں" جو حال ہوا فیض استاد سے جو رہ گیا اپنے قصور استعداد سے"۔ رسالہ استاذ العلماء میں مولوی امانت اللہ صاحب مرحوم کا حال لکھ کر تحریر فرماتے ہیں، باسٹھ برس (۶۲) کی عمر کا سرمایہ دو لفظ ہیں، پڑھا اور پڑھایا"۔ مقدمہ دیوان درد میں لکھتے ہیں" شروانی دہقانی مقدمہ نگاری پر مامور ہے"۔ یہ تین نمونے اس وقت دماغ میں موجود تھے جن کو پیش کر دیا، بیسیوں جملے اسی قسم کے انکی تحریروں میں موجود ہیں،

ان کا ادبی ذوق ایک ایسا بڑا عنوان ہے جس کو بہ تفصیل لکھنا بہت مشکل ہے، شاید ہی کوئی مجلس ایسی ہوتی ہو جس میں ادبی ذوق کے جوہر ظاہر نہ ہوتے ہوں، جب میں حاضر ہوتا، اس قسم کی گفتگو میں، وہ سخن میری طرف کر لیتے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے دیوان طبع ہو چکے ہیں، کبھی خود اپنے اشعار سنا کر حاضرین کو لطف اندوزی کا موقع دیتے، اور کبھی استادوں کا چیدہ چیدہ کلام پیش فرما کر کیفیت پیدا کرتے جو کیفیت اسوقت پیدا ہوتی اسکو احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں، یہاں میں اس تحریر میں جان ڈالنے کیلئے ان کے کچھ اردو فارسی کے اشعار نقل کرتا ہوں،

اردو

جلوہ فرما تو ہوا صحرا گلستاں ہو گیا — تو چلا منہ پھیر کر گلشن بیاباں ہو گیا

آنکھ جب بند ہوئی تب کھلیں آنکھیں اپنی — بزم یاراں جسے سمجھے تھے وہ زنداں نکلا

پھول فرقت میں تری خار ہوئے جاتے ہیں — ہلکے پھلکے ہیں مگر بار ہوئے جاتے ہیں

کیے دیتی ہے وحشت پارہ پارہ کسوت ہستی — کہاں فرصت کہ بیٹھوں چاک کرنے میں گریباں کو

حیا، ناز، پندار، رعب و تغافل — تمہارے بھی ہیں پاسباں کیسے کیسے

تاب نظارہ تو جب ہو کہ رہیں ہوش بجا — پھر کہاں ہوش جو ہو سامنے صورت تیری

فارسی

دل پری بردہ اگر بردہ ز من نیست عجب — اہرمن بردہ ز کف مہر سلیمانے را

ہمت ما سر تہی آرد بہ مال و زر فرود — دولت ما بس بود آں شوخ سیم اندام ما

دلم با ساغر و مینا تہی گشد حسرت — کہ بردہ نرگس مستانہ ز خود مارا

فدائے زخم نگاہت ہزار مرہم باد — نثار درد تو سازم ہزار درماں را

واہ کہ مملکت عشق دیاریست غریب — کہ شہ غازی محمود غلام است اینجا

ہوائے باغ بہ ہجر تو سازگارم نیست — جدا ز کوئے تو ذوقے بہ نوبہارم نیست

باد چمن علاج تپ دل نمی کند — عیسی دمے ز گوشہ دامانم آرزوست

از بن ہر موئے حسرت نالہ سر می زند — نغمہ ہائے دلکشا در بند چوب تار نیست

ز بدخشاں لعل و از عمان گہر — جوہر طبعم ز کانے دیگر است

منت رائحہ نافہ و غنچہ نہ کشند — سرخوشانے کہ بہ بوئے دہنے ساختہ اند

شاہباز ہمتم ربطے بدست شاہ داشت — خوش نکردہ بند دست دیگراں پرواز کرد

ز چشم مست تو مستم شراب را چہ کنم — ز تاب حسن تو سوزم کباب را چہ کنم

نکرد جلوہ بت شوخ باختم دل و دیں — اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم

در حریم وصل جانانم وطن خواہد شدن — شمع بزم انس آں ماہ ختن خواہد شدن

نگاہ شوخ بہ چشم سیہ بداں ماند — کہ مست ناز خرامد بتے بہ بت خانہ

اے کہ از غایت لطافت طبع — سحر نو بہار را مانی

ربودہ ہوش و قرارم غزال رعنائے — نگاہ مست خرامے بلند بالائے

مداوائے مریض عشق قانون دگر خواہد — طبیب درد دل آں نرگس بیمار باید

مجموعی حیثیت سے ایک نظر

خلاصہ یہ ہے کہ نواب صاحب مرحوم سید تھے اور سچے آدمی تھے، ایچ پیچ سے پاک، نہایت مہذب اور شائستہ، ان کی ہر ادا اور ہر بات انتہائی شائستگی سے پر تھی، اس زمانہ میں ان کی ذات قدیم تہذیب کا مجسم نمونہ تھی، پاکیزگی اور صفائی نظر پڑتے ہی نمایاں ہوتی جس کے اندر وجاہت اور جمال صوری کی درخشانی بدرجہ اتم تھی، گفتگو میں وہ لطف تھا کہ مجلس کے مقرر وقت پر میری تو یہ حالت تھی کہ سب کاموں کو چھوڑ اس میں شرکت کے لیے مستعد ہو جایا کرتا، کبھی ناغہ کرنے کو جی نہ ہوتا، ان کی ذات ایسی بہت سی بے مثال صفات کا مجموعہ تھی جو اس زمانہ میں مفقود ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو بہشت بریں میں بلند درجات پر فائز کرے، ویرحم اللہ عبداً قال امینا

اب میں اس تحریر کو متمم بن نویرہ کے دو حسب حال بیتوں پر ختم کرتا ہوں،

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ — من الدہر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا كأنی ومالكا ۔۔۔ لطول اجتماع لم نبت ليلة معا

اردو کا ایک مشہور مصرعہ بھی یہان موزون ہوگا ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ضمیمہ | محترم جناب مفتی عبد اللطیف صاحب سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ اس مخصوص نمبر کے لیے کچھ تحریر فرمائین کہ ان کی تحریر بہت قیمتی ہوتی، لیکن انھون نے فرمایا کہ وہ لکھنے پر قادر ہی نہین، اور یہ مصرع پڑھا،

حدیث دل بکہ گویم عجب غمے دارم

میرے اصرار سے اس پر راضی ہوئے کہ چند باتین مجھے بتلا دین جنکو مین لکھکر بطور ضمیمہ اپنی تحریر مین شامل کردون، چنانچہ جو کچھ موصوف نے فرمایا وہ درج ذیل ہے، لیکن قبل اس کے یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نواب صدر یار جنگ مرحوم، مفتی صاحب اور مین تینون ایک ایسے لازوال رشتے مین منسلک ہین جو کبھی ٹوٹ نہین سکتا، اور جس کی طرف مین نے اپنی ایک عربی تحریر مین بایں الفاظ اشارہ کیا تھا،

ولعلوا اننا أغصان شجر واحد و تلامیذ استاذ ماجد،

۱۳۱۰ھ مین مفتی صاحب استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے تھے، اسی سال مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی مرحوم بھی درس مین شریک ہوئے، اور اس طرح پر کئی سال تک دونون صاحب ہم سبق رہے، اس وقت سے اس وقت تک کہ اکسٹھ سال کا زمانہ گذر گیا، باہم تعلقات مین شگفتگی ہی بڑھتی چلی گئی، طالب علمی مین ساتھ رہا، ندوۃ العلماء مین ساتھ رہا، حیدرآباد مین ساتھ رہا، اور آخر مین علی گڈھ مین ساتھ رہا، سفرون مین بھی بارہا رفاقت رہی غرض جو ارتباط قائم ہوا، ایسا تھا، کہ اس سے زیادہ نہین ہو سکتا، نواب صاحب مرحوم کو جو محبت مفتی صاحب کے ساتھ تھی اس کا ذکر میری تحریر مین اوپر گذر چکا ہے، مفتی صاحب کے تعلق کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اب اکثر یہ شعر انکے ورد زبان رہتا ہے:

آتش اندر آشیان بے رحم صیادان زدند
در گلستان مشتِ خاشاکے و تخم نہ گذاشتند

کرے دے کے ایک ہی ذات سے تعلق تھا، وہ بھی نہ رہی

مفتی صاحب فرماتے ہین کہ شروانی صاحب مرحوم کی طالب علمی کی شان یہ تھی کہ ٹھیک بارہ بجے دن کو ان کا سبق ہوتا، گھوڑے پر سوار ہو کر پڑھنے آتے، ایک سائیس گھوڑے کا اور ایک خدمتگار کتابین ہاتھ مین لیے ساتھ ہوتا، کیسی ہی لو دھوپ یا بارش ہوتی، ناغہ نہ کرتے، اور بہت پابندی کے ساتھ ٹھیک وقت پر سبق کے لیے استاد کی خدمت مین پہنچ جاتے، جب مولانا کا کمرہ چالیس یا پچاس قدم رہ جاتا، گھوڑے سے اتر کر کتابین اپنی بغل مین لیتے اور استاد کی خدمت مین ادب کے ساتھ حاضر ہو جاتے، یہ معمول چند روز نہ تھا، بلکہ مستقل تھا، ایک رئیس زادہ کو تحصیل علم کا اتنا شوق جس کے لیے کسی تکلیف کی پروا نہ کرنا لائق صد آفرین اور قابل تقلید ہے، جس سے اس زمانہ کے طلبہ کو سبق سیکھنا چاہیے، اس شان سے طالب علمی کا زمانہ گذرا اور بعد فراغت مطالعہ اور تحریر و تقریر کے میدان مین قدم رکھا، استعداد پختہ تھی، نتیجہ یہ کہ تحریر مین وہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ ہر شخص نے مدح سرائی کی، خاص خوبی یہ تھی کہ مطالب کی جامع ہوتی اور حشو و زوائد سے پاک بندش چست، تقریر مین وہ ملکہ حاصل کیا کہ کوئی علمی اور اسلامی مجلس ان کی تقریرون سے خالی نہ رہتی تھی خواہ نزدیک ہو یا دور، ایک بار پٹنہ مین ندوۃ العلماء کا جلسہ تھا، اندازہ ہے کہ پچاس ہزار کا مجمع ہوگا، جس کے اندر اس زمانہ کے بڑے بڑے اشخاص مثلاً سر علی امام، جسٹس شرف الدین، حسن امام وغیرہ وغیرہ شریک تھے، شروانی صاحب کی تقریر جب ہوئی تو مجمع کا ہر شخص از خود رفتہ ہو گیا، خصوصیت کے ساتھ سر علی امام اور ان جیسے دیگر اشخاص بالکل بے قابو تھے،

تحریر اور تقریر کے علاوہ جو ایک بہت بڑا کام انھون نے انجام دیا وہ انکا کتبخانہ ہے، شخصی محنت سے اتنا بڑا کتبخانہ جمع ہونے کی مثال اس صوبہ یوپی کے اندر نہین، گویا یہ ایک فرض کفایہ تھا جو انھون نے پورے یوپی کی طرف سے ادا کیا، اس کتبخانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف نوادر اسمین جمع کیے گئے ہین،

علم کے ساتھ ساتھ خدانے ان کو فہم سلیم عطا فرمائی تھی، مفتی صاحب سے انکی گفتگو ہر قسم کے علمی مسائل پر ہوتی رہتی تھی، جس سے اس بات کا مفتی صاحب کو یقین ہو گیا کہ مرحوم صحیح بات ہمیشہ فوراً سمجھ لیتے تھے، مزاج مین کجروی بالکل نہ تھی اور غلطیات ہرگز نہ مانتے تھے، مفتی صاحب سے استاد بھائی ہونے کے علاوہ پیر بھائی کا بھی رشتہ تھا، مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت اس طریق پر ہوئی کہ ملاقات کے بعد تمام رات بےچینی مین کٹی جس کی وجہ یہ بتلاتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے تمام گناہ پیش نظر تھے، صبح کو مرید ہونے کے بعد وہ کیفیت زائل ہو گئی، مولانا نے دعا دی کہ خدا قرض سے بچائے، جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ عبدالشکور خانصاحب کے انتقال کے بعد جائداد پر تین لاکھ کا قرضہ تھا، اسکو ادا کیا، خود کبھی قرضہ نہین لیا، آمدنی مین خدانے ایسی برکت دی کہ امور خیر بھی جاری رہے اور لاکھون روپیے کی جائداد خریدی، برادری مین اس طور پر لوگون کی امداد کی کہ جو کوئی مقروض ہو جاتا وہ اپنی جائداد ان کے ہاتھ مین دیدیتا، یہ اس کا قرض ادا کرکے جائداد واپس کر دیتے،

سرکاری خطابات اور کونسلون کی ممبری سے باوجود اتنی بڑی ریاست کے سخت نفرت تھی، ایک بار خطاب کی سفارش گورنمنٹ مین گئی، خطاب آنے سے پہلے شروانی صاحب کو پتہ لگ گیا، سخت وحشت ہوئی، اور کوشش کرکے خطاب کو رکوا دیا، اگر وہ چاہتے تو بہت سے خطابات، کونسلون کی ممبری ان کو بہت آسانی کے ساتھ مل جاتی، مگر ان کی زندگی تو دوسرے ہی مقصد کے لیے تھی، تمام زندگی کا کارنامہ دو باتین ہین، علم حاصل کیا اور اسلام کی خدمت کی، مختصر یہ ہے کہ شروانی صاحب مرحوم اپنی صفات مین بےنظیر تھے، آخر مین یہ شعر پڑھا،

اندکے باتو بگفتم و بہ دل ترسیدم
کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اعتراف

از جناب سید معین الدین صاحب مرحوم مترجم نپولین اعظم وغیرہ

ہمہ شہر پر ز خوبان منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبین نکند بکس نگاہے

سید معین الدین صاحب مرحوم شاہجہانپوری اپنے زمانہ کے مشہور مترجم اور صاحب قلم تھے، جیسا کہ اس مضمون سے ظاہر ہوگا، یہ اعتراف انھون نے آج ۲۳ سال پہلے بطور وصیت نامہ کے لکھا تھا، جسے بعد مین معارف مین اشاعت کے لیے بھیجدیا تھا، لیکن شاید اسکی نوبت اسی لیے نہین آسکی کہ وہ مولانا شروانی کی یادگار مین کام آئے، اسلیے مضمون نگار کی وصیت کی تکمیل کے لیے اس کو اس نمبر مین شائع کیا جاتا ہے، جو اس کے لیے سب سے زیادہ موزون ہے۔ "م"

۲۶ نومبر ۱۹۲۷ء کو یہ مضمون "اعتراف" کی سرخی سے مین نے اس وقت لکھا تھا جب کہ چھ سال متصل حیدرآباد دکن کے عہدہ منتظمی دفتر پیشی صدر الصدوری امور مذہبی پر کام کر چکنے کے بعد مین اپنے وطن شاہجہانپور واپس آیا تھا، منشا صرف یہ تھا کہ اپنی علمی شہادت بطور وصیت کے تحریر کے ذریعہ سے اپنے پیچھے چھوڑ جاؤن جس ذات گرامی کے متعلق یہ اعتراف مین نے لکھا تھا وہ ایک غیر معمولی شخصیت ہے اور مجھکو یہ درد انگیز خیال تھا کہ قاعدہ قدرت کے موافق وہ ذات گرامی ایک دن اس دار فانی سے اٹھ جائیگی، اور مین بھی نہ رہونگا، پس اس ذات گرامی کی اگر کبھی سیرۃ لکھی جائے تو میرا یہ "اعتراف" اس سیرۃ کا ایسا ایک باب بن سکے جس سے

زیادہ سچا دوسرا کوئی واقعہ اس سیرۃ مین دکھایا نہ جاسکے، مین نے اس اعتراف کی تمہید مین لکھا تھا "میری سچائی کی دلیل یہ ہے کہ اب جبکہ مین یہ اعتراف لکھ رہا ہون نہ اس ذات گرامی سے میرے کوئی دنیاوی نفع کا واسطہ باقی ہے، نہ مجھ پر کوئی دباؤ ہے، پس جو کچھ یہان لکھا جاتا ہے وہ آلودگی اور ہر قسم کی لوث سے انشاء اللہ پاک ہو"

لیکن ان پچھلے چار سال مین حالات نے کچھ ایسے پلٹے لیے کہ حیدرآباد چھوڑنے کے بعد مجھے پھر معلوم نہ ہوا کہ وہان کیا ہو رہا ہے، تین برس تک اس ذات گرامی سے جس کے ساتھ پورے چھ سال مین ایک ہی کوٹھی مین رہ چکا تھا اور جس کا مین سب سے بڑا سررشتہ دار تھا کسی قسم کی خط وکتابت بھی نہ ہوئی کہ اب یکایک معلوم ہوا کہ استعفی کے ذریعہ سے اس ذات گرامی نے حیدرآباد سے تعلق قطع کر لیا، چونکہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہے، جبکہ مین زندہ ہون، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "معارف" کے ذریعہ سے اپنا یہ اعتراف ناظرین کے سامنے پیش کر دون، میرا مدعاے اصلی اس طرح پورا ہو جائے گا، یعنی جب سیرۃ لکھی جائے گی تو معارف ہی سے سیرۃ نگار یہ سطور چن سکے گا،

وہ ذات گرامی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا مولوی محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی کی ہے، جس سے اس اعتراف مین مجھے بحث کرنی ہے، مین اس طولانی داستان سے بات کو طول نہ دون گا، کہ شروانی صاحب سے کب اور کس طرح میری ملاقات ہوئی اور اس تیس برس مین باہمی ربط و قدردانیون نے کیا منزلین طے کین، اسلئے اصل مدعا کی طرف آتا ہون،

انتیس[۲۹] برس سررشتہ تعلیمات مین کام کرنے کے بعد مین نے سلطانپور سے گورنمنٹ کی ملازمت سے استعفی دیا، اور ہز ہائی نس نواب صاحب باؤنی کا پرائیویٹ سکرٹری ہوا، ڈیلی کالج اندور مین نواب صاحب ممدوح کا گورنمنٹ صوبہ متحدہ کے حکم سے مین پہلے اتالیق رہ چکا تھا، اسی زمانہ مین شروانی صاحب حیدرآباد دکن کے صدر الصدور امور مذہبی ہوئے، مین باؤنی مین دو برس کام کرنے پایا تھا کہ شروانی صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لیا، اور حیدرآباد مین اپنے دفتر پیشی کا، سرکار آصفیہ

کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد، منتظم کر دیا، یہ تقرر ۹ رجون ۱۹۲۰ء مطابق ۲۰ ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو ہوا، اب مین اس منزل پر پہنچ گیا کہ شروانی صاحب سے میرا ہر وقت کا ساتھ ہے اور مجھکو موقع ملتا ہے کہ انکو اتنے قریب سے دیکھون جتنے قریب سے دیکھنا ممکن ہے، غالباً میرا خیال صحیح ہے کہ کسی دوسرے کو متصل چھ سال ایسے نہ ملے ہون گے کہ اس نے ایک جاسوس کی طرح شروانی صاحب کی زندگی کا ہر پہلو میرے جیسے مشاہدے کی نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اپنے نہایت باقاعدہ روزنامچہ کی جلدون مین یہ پہلو برابر قلمبند کیے ہون،

اب مین چھ برس کا تجربہ اور مشاہدہ اس اعتراف مین نہایت دیانت اور راستی سے لکھتا ہون کہ مین نے شروانی صاحب کو کس عالی رتبہ کا باعمل مسلم پایا، لیکن اتنا پھر لکھنا ضروری سمجھتا ہون کہ چونکہ مین شروانی صاحب کو اچھی طرح جانتا ہون اور یہ اعتراف اب ان کی نظر سے بھی گذرے گا، اگر خلاف واقعہ مین نے کوئی بات لکھی ہو تو میرے حق مین سب سے زیادہ سخت نکتہ چین وہی ہون گے، اور مجھ پر سب سے زیادہ نفرین وہی کرین گے، چنانچہ جو کچھ شروانی صاحب کے متعلق مین آگے لکھتا ہون مین ان کو ایسا ہی جانتا ہون، اس کے بعد اصل علم خدا کو ہے اور صحیح اور بہتر جاننے والا وہی ہے،

وضع، شکل وصورت صحیح مسلمانہ وضع قطعی مشرقی، حسن صورت ہزارون مین ایک، حیدرآباد کے عظیم الشان جلسون مین مین نے یہی پایا کہ سب سے پہلے نظر انھین کی طرف بے ساختہ اٹھتی تھی، جمال صورت کے ساتھ مسلمانہ عبا، عمامہ اور لباس سبحان اللہ، حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی کسی سرکاری تقریب مین بھی شروانی صاحب نے مغلی دستار کبھی سر پر نہ رکھی، اگرچہ ان کی پیشی مین مجھکو پچھلے تین سال پیشی کے وقت مغلی دستار استعمال کرنی پڑی،

انشاء شروانی صاحب کی انشاء مین ایک چاشنی اور وہ ذائقہ ہے کہ صاحب ذوق ہی وہ لذت جان سکتا ہے، وجہ اس چاشنی اور لذت کی یہ ہے کہ چونکہ وہ فارسی اور اردو کے ایک گران پایہ شاعر ہین،

اگرچہ وہ شاعری کی مشق نہین کرتے، اس لیے نثر مین شاعرانہ تخییل داخل ہو کر نثر کا پایہ نہایت بلند کر دیتی ہے، بجلے چھوٹے چھوٹے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ و لغات سے پاک، لیکن آمد مضامین کی رَو مین کبھی توارد کا واقعہ ہو جاتا یا کہین پر خفیف عرقِ ظرافت کی جھلک ناوک و نشتر کی گویا چھیڑ ہوتی ہے، مین نے چونکہ ان کے ہر قسم کے مسودات کثرت سے صاف کیے ہین، ان کی نثر کا اسلوب مین جانتا ہون، منصف مزاج ایسے کہ زبان کے متعلق کسی لفظ کے استعمال کے متعلق جب کبھی مین نے اپنا کوئی خطرہ یا شبہہ ظاہر کیا، انھون نے کبھی برا نہ مانا، فوراً تحقیقات کی، اگر میرا خطرہ یا شبہہ صحیح ہوا تو نہایت مسرت سے انھون نے قبول کر لیا، اگر مین غلطی پر ہوا تو خود میری غلطی کی اصلاح ہو گئی، ان کے انشا مین بیکار اور زائد باتون کا دخل نہین،

تقریر مین نے شروانی صاحب کی قریب قریب ہر ایک تقریر حیدر آباد مین سنی ہے، تقریر عام فہم، تقریر کا ایک خاص مرکز و مقصد، پیرایہ دلون سے استغاثہ کرنے والا، مذہبی تقریرین رطب و یابس روایات سے قطعی پاک، تقریر مسلسل، برجستہ اور آخر مین اپنے مرکز و مقصد پر پہنچ جانے والی، اور تقریر کا منتہاے کمال یہی ہے، اعلحضرت سلطانِ دکن مدظلہ العالی کی موجودگی مین بھی مین نے دیکھا ہے کہ بال برابر بھی لہجہ یا تقریر کے تیور مین فرق نہین آتا،

وقت کی قدر اور تقسیم اوقات روزمرہ واہیات اشغال مین اپنے نفس کے رجحان سے کبھی وقت ضائع کرتے مین نے شروانی صاحب کو نہ دیکھا، حبیب گنج مین فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کے بعد سب سے پہلا کام وہ یہ کرتے تھے کہ رخصت ہونے والے پردیسیون اور مسافرون کو رقمین دیتے، پھر اپنے باغ کی سیدھی طولانی روش پہ تسبیح لیے ہوئے متصل ایک گھنٹہ کے قریب ٹہلتے اور وظیفہ پڑھتے رہتے، ایک مضبوط عموماً مرزا پوری بانس کی چھڑی ان کے ہاتھ مین ضرور ہوتی، چھڑی کبھی ترک نہ کی جاتی، حتی کہ جب مسجد کو جاتے تب بھی چھڑی ہاتھ مین لے جاتے، حیدر آباد مین بھی فجر کی نماز کے بعد ٹہلنے اور وظیفہ کا یہی دستور تھا، لیکن یہان مسافرون اور پردیسیون کی جگہ اطراف کے چھوٹے چھوٹے بچے جن کی تعداد کبھی ایک سو سے زیادہ ہو جاتی تھی،

شروانی صاحب کو گھیر لیتے تھے، اور شروانی صاحب ہر ایک بچہ کو ایک ایک پیسہ دیتے اور مسکراتے جاتے اور کسی بچہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی پھیرتے تھے، وظیفہ سے فارغ ہو کر چاے پیتے اور خطوط لکھنے شروع کر دیتے، دس بجے عموماً اجلاس پر آجاتے اور اسوقت تک کام کرتے کہ آج کا سب کام ختم ہو جاتا، ہر ایک مثل خود پڑھتے اور ہر ایک حکم اپنے قلم سے لکھتے، ظہر اور عصر کے درمیان کوٹھی کی بالائی منزل پر اتنی بلند آواز سے روزمرہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے کہ آواز نیچے صاف سنائی دیتی، نماز ظہر کے بعد بھی ہمیشہ چاے پیتے تھے، حیدر آباد مین نماز عصر کے بعد وہ بالاخانہ سے نیچے اترتے، مغرب تک یا تو ملاقاتیون سے ملاقات ہوتی یا موٹر مین سوار ہو کر ہوا خوری کو جاتے، عموماً مین ساتھ ہوتا اور اس وقت مزاج کی شگفتگی اپنی بہار پہ ہوتی، واپسی پر نماز مغرب عموماً خود پڑھاتے، لیکن اگر کوئی اور صاحبِ عبا و عمامہ موجود ہوتے تو انھین کو امام بنا دیتے، خود نماز پڑھاتے تو اس نماز مین اور اُس نماز مین جو وہ سنت یا نفل کی صورت مین تنہا پڑھتے تھے، بڑا فرق ہوتا، یعنی جب امام ہوتے تو قراءت مختصر اور ارکان نہایت معتدل ہوتے، مقتدیون پر وہ نماز کبھی بار نہ ہوتی، لیکن جب تنہا پڑھتے تو ارکان طولانی ہوتے، صحت ارکان کا یہ حال دیکھا ہے کہ کبھی سجدے سے وہ جانماز پر ہاتھ ٹیک کر نہ اٹھے، پس اگر صحیح نماز پڑھنی ہو تو شروانی صاحب کو نماز پڑھتے ہوے غور سے دیکھ لینا کافی ہے، مغرب کی نماز کے بعد وہ جانماز پر دیر تک بیٹھتے، پھر ایک لمبی دعا مانگتے، فجر کی نماز جماعت مین بھی یہی دیکھا کہ عموماً وہ سب مصلیون کے بعد مسجد سے باہر آتے،

مغرب کی نماز کے بعد حیدر آباد مین وہ ملاقات کے کمرہ مین بیٹھتے، ملاقاتی ہوتے تو ملاقات کرتے ورنہ اخبار دیکھتے، رات کا کھانا عشا کی نماز پڑھکر کھاتے، اس کے بعد مطالعہ شروع ہوتا، اور نہین کہا جا سکتا کہ کب تک ہوتا رہتا، انھین اوقات مین کمیٹیون کی شرکت، مدارس مین دینیات کے معاینے، تقریبات دعوتون، تقریرون، وعظون غرض ان سب ہی ضروریات کے لیے وقت نکال لیا جاتا،

لطیفہ مین نے حیدر آباد مین اکثر دیکھا کہ مغرب کی نماز کی جس وقت شروانی صاحب امامت

کھڑے ہوتے تھے تو اس وقت بعض بڑے عہدیدار جن کا عموماً سررشتۂ تعلیمات سے تعلق تھا، ان میں ایسے بھی تھے کہ ولایت میں انگریزی تعلیم پائی تھی، نہایت آسودہ اور بے غم مغرب کی جماعت میں شریک ہونے کے بجائے کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہتے تھے، ایک دن میں نے شروانی صاحب سے کہا کہ "آپ ان مسلمانوں کو ہدایت کیوں نہیں فرماتے کہ نماز کا احترام کریں، اور جماعت میں شریک ہوا کریں"، اس پر شروانی صاحب نے مجھے یہ جواب دیا "منتظم صاحب، ان لوگوں کو ابھی ٹھوکر نہیں لگی ہے، ایک ٹھوکر میں یہ سیدھے ہو جائیں گے، کسی کی ہدایت کی ضرورت نہیں"، اس کی تصدیق بہت جلد ہو گئی، یعنی چند ہی روز بعد میں نے ایک کو ایسا نمازی پایا کہ ریل میں بھی ان کی تسبیح اور جانماز کا پورا اہتمام رہتا تھا، یہ ٹھوکر کھائے ہوئے تھے،

کثرت مشاغل | شروانی صاحب کی تحریر دن کے حجم سے مجھ پر ہول طاری ہو جاتا تھا، ہر ایک مثل وہ خود پڑھتے اور سب احکام اور تجویزیں اپنے قلم سے لکھتے، امور مذہبی اور صدارت العالیہ کا کام انجام دینے کے ساتھ وہ عدالت العالیہ کے خاص اور اہم دیوانی کے مقدمات میں ججوں کے افسر بنائے جاتے تھے، جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبوں کے وہ رکن تھے، کتب خانۂ آصفیہ، دار العلوم نظامیہ، شعبۂ تالیف و ترجمہ، دار الاشاعت، کتب درسی کا احتساب، مختلف مصنفین و مؤلفین کی تصنیفات و تالیفات پر اعلیٰ حضرت معظم کو ناقدانہ تحریری رائے کا بھیجنا، مدارس کے معائنے، دورے، امکنۂ مذہبی کی جانچ پڑتال وغیرہ، مذہبی جلسوں میں وعظ، ادھر ہندوستان میں وقف کرنال، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی کے شعبوں کی رکنیت، تعلیمی کانفرنس کی شرکت، صدارت کے خطبات، ندوۃ العلماء کے اہم امور میں عملی شرکت، اپنے عظیم الشان تعلقہ اور کتاب خانہ کی داشت و نگرانی، کثیر خط و کتابت، سلسلۂ تالیف، دیوانوں، تذکروں اور مثنویوں پر مبسوط مقدمات لکھنا، مواعظ کے مستقل رسالے بنا دینا، رسالوں میں مضامین لکھنا، اس کے ساتھ کتابوں کا مستقل مطالعہ، گویا وقت کا ہر ہر لمحہ کام میں

لگا ہوا، اور ہمیشہ یہی دیکھا کہ وہ ایسا کام کرتے تھے جو کرنے کے لائق ہوتا تھا، نہ وہ کام جس کے کرنے کو جی چاہے، مطالعہ کا اندازہ کسی قدر اس سے ہو سکتا ہے کہ حبیب گنج کے کتاب خانہ سے میں نے بہت دفعہ کتابیں لیں، کھولیں اور بہت سی پڑھیں بھی لیکن کوئی کتاب ایسی نہ ملی جس میں پنسل یا قلم سے شروانی صاحب کے مطالعہ، صحت یا رائے وغیرہ کے نشانات نہ پائے ہوں، ان کی معیت میں چھ سات سال کے دوران میں ہر سال حیدرآباد سے ہندوستان کو دو دفعہ آنا اور واپس جانا ہوتا تھا، اس طولانی سفر میں ان کا عزیز شغل مطالعہ رہتا تھا، روزانہ اخبار، ماہوار رسالے وغیرہ سبھی کچھ پڑھ لیتے تھے، کتب خانۂ آصفیہ سے ان کے مطالعہ کے لیے کتب تاریخ، سیر اور تفسیر میں برابر منگاتا اور واپس کرتا تھا،

دیانت اور تقوی | حیدرآباد میں سرکاری کام مستثنیٰ کر کے اپنے خانگی اور نجی کام میں شروانی صاحب نے کاغذ، روشنائی، قلم اپنے ذاتی استعمال کیے، خود ان کی ذات کا تو تذکرہ ہی کیا ہے، ان کی پیشی کے دفتر میں کسی اہل معاملہ کو کبھی یہ ہمت نہ ہو سکی کہ کسی ناجائز مطلب کے نکال لینے کے واسطے رشوت تو درکنار کوئی معمولی سوغات یا تحفہ پیش کر سکتا،

کسی بڑے امیر کی ایسی تقریب میں جہاں رقص و سرود ہو شروانی صاحب کبھی شریک نہ ہوئے اور جہاں ایسا احتمال ہوتا وہاں دعوت دینے والے امیر سے بذریعہ تحریر پوچھا جاتا تھا کہ "کوئی ایسی ویسی تفریح تو نہیں ہے"؟ چنانچہ جب حیدرآباد کے امراء کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ایسی تقاریب میں جہاں یہ خرافات ہونے کو ہوتے وہ شروانی صاحب کو مدعو ہی نہ کرتے تھے، ایسے ڈنروں، دعوتوں اور جلسوں سے جہاں کوٹ پتلون، لیڈیاں، انگریز اور ہندوستانی نیم جنٹلمین جمع ہوتے شروانی صاحب کو عموماً پرہیز رہا، میں نے دیکھا ہے کہ جب کوئی "جنگ" یا "ملک" شروانی صاحب کی ملاقات کو آیا، تو سرکاری کام سے تو مجبوری تھی، مگر ان کو ایسی ملاقاتوں سے وہ لطف نہ آتا تھا جو علماء سے ملاقات میں آیا کرتا تھا،

بزرگان دین یا ان کے مزارات کا احترام کوئی شروانی صاحب سے سیکھے، مین نے ان کو حبیب عیدروس صاحب کے حضور مین حاضر ہوتے بھی دیکھا ہے، اور گلبرگہ شریف مین حضرت بابا گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر اور بہاری شریف کے حضرت شاہ شرف الدینؒ اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر خلد آباد شریف مین بھی شروانی صاحب کی مخصوص حالت دیکھی ہے، اچھی قوالی کا ان پر یہ اثر ہوتا کہ وہ قطعی ساکت ہوجاتے،

جمعہ کے دن کا خاص احترام ہوتا تھا، آج شروانی صاحب سرکاری کام کو ہاتھ نہ لگاتے، نماز جمعہ کی حیدرآباد مین خاص طریقہ سے تیاری کی جاتی، عمدہ لباس، عبا، عمامہ، عطر مین بسے ہوئے، اور اس پر شروانی صاحب کا حسن صورت، بس کچھ نہ پوچھیے، حیدرآباد کی مکہ مسجد مین ہمیشہ جمعہ کی نماز پڑھتے، پہلی صف مین امام سے پیچھے ان کی جگہ خالی رکھی جاتی، لیکن مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اگر تین چار صفین بھر جاتے پر وہ مسجد مین پہنچتے تو پھر مصلیون کو چیر اور پھاند کر وہ اگلی صف مین کبھی اپنی خالی جگہ پر نہ جاتے بلکہ نہایت خاموشی سے کسی مناسب جگہ پر پیچھے ہی بیٹھ جاتے،

حیدرآباد مین مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اپنی تنخواہ، جو دو ہزار تین سو روپیہ ماہوار تھی، شروانی صاحب نے کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھی، وہ روپیہ کی حقیقت سنگ ریزہ کی برابر سمجھتے، اکثر مقروض رہتے اور حبیب گنج سے برابر روپیہ منگاتے رہتے، کبھی وہ ایسے خالی ہاتھ ہوجاتے کہ مسافر، نو مسلم، حاجتمند کی امداد کو اپنے خادم سے قرض لیتے، نیا کپڑا بناتے تو عموماً استعمالی پرانے، جو بڑے گنتی پڑانے گھر بھیجے تقسیم کر دیے جاتے، یہ بات بھی مین نے اچھی طرح دیکھی ہے کہ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے عالمون سے وہ سب سے بڑے قدردان تھے، اس گروہ کی وہ انتہائی عزت کرتے تھے،

لیکن ایک چیز کی شروانی صاحب کو مین نے ضرور ہوس یا حرص دیکھی، وہ چیز کتاب تھی، نادر، کمیاب، پرانی قلمی یا مطبوعہ کتاب وہ کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑتے تھے، مجھے صحیح اندازہ نہین کہ کتابین جمع کرنے مین انھون نے کس قدر روپیہ صرف کیا، حبیب گنج کے اپنے کتاب خانہ مین ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا،

"منظم صاحب، یہ کتابین میری چوالیس برس کی سعی کا نتیجہ ہین"،

تمامی عمر مین شروانی صاحب نے صرف ایک عمارت بنائی ہے، وہ بھی ان کی نہین، خانۂ خدا ہے، حبیب گنج مین جا کر اس خانۂ خدا کی جلوہ ریزی دیکھیے خصوصاً جب بھادون کی بھرن برس رہی ہو، اور کالی گھٹائین چڑھی ہون، یا طلوع آفتاب سے پہلے یا چاندنی رات مین،

رمضان المبارک مین شروانی صاحب اپنی کوٹھی کے احاطہ مین ہمیشہ بہترین حافظون سے دو قرآن مجید جماعت کے ساتھ سنتے، اور حافظون کو نہایت معقول نذرانے اور خلعت دیتے، جماعت مین ان سے بائین ہاتھ کو میری جگہ مقرر تھی، وہ عموماً عطر مین ایسے بسے ہوتے تھے کہ تیز خس کے عطر کی خوشبو سے جماعت مہک جاتی، اور کبھی مجھکو چھینکین آنے لگتین، یہی حالت افطار کے موقعون پر ہوتی، اور افطار کے جلسہ مین سب سے زیادہ بشاش وہی ہوتے، رمضان کا فریضہ وہ نہایت اہتمام اور خوشی سے ادا کرتے، وہ تمبا کو کھاتے ہین نہ حقہ پیتے ہین،

ربیع الاول شریف مین مجالس عید میلاد شروع ہوتین، یہ سلسلہ ربیع الثانی تک حیدرآباد مین جاری رہتا اور جن پیمانون پر یہ مجالس ہوتین حیدرآباد کو یہ بات پہلے کبھی نصیب نہین ہوئی تھی، شروانی صاحب ان جلسون کے صدر ہوتے، ان جلسون مین انھون نے نہایت معرکۃ الآرا وعظ کیے، اعلیٰحضرت بھی بعض جلسون مین شرکت فرماتے، شروانی صاحب ان ایام مین حیدرآباد کے مسلمون مین محبوب ترین ہستی تھے، ربیعین کی راتون کو تھیٹر اور سینما خانے عموماً مسلمانون سے خالی ہو جاتے، اسلام نے ایک عملی رنگ اختیار کر لیا تھا، بعض مجالس کے حالات مین نے منظوم کیے ہین، اور اکثر وعظون کے نوٹ میرے روزنامچون مین محفوظ ہین،

جن لوگون نے شروانی صاحب سے پہلے حیدرآباد کے محرم، رمضان، اور ربیعین وغیرہ دیکھے ہین اور حالات مذہبی پر نظر کی ہے، اب وہ اسی حیدرآباد کو شروانی صاحب کی صدر الصدوری

حیدرآباد مین خدمات کا مختصر کارنامہ

کے زمانہ مین دیکھین اور دونون حالتون کا مقابلہ کرین، اگر صدر المہام فینانس جو ایک مسلمان ہے، مسٹر گلانسی
عیسائی انگریز سابق صدر المہام فینانس کی طرح مالی معاملات مین صیغۂ امور مذہبی کے ساتھ کشادہ دلی
سے پیش آتا تو مین بڑے بڑے اسلامی رفاہ و ترقی کے واقعات دکھا دیتا، کیونکہ مین اسی امور مذہبی کے صیغہ
کا سب سے بڑا سر رشتہ دار تھا، اور ہر بات میرے ہی ہاتھون سے ہوتی تھی، لیکن پھر بھی اس گئی گزری مالی حالت مین
شروانی صاحب نے جو کچھ کر دکھایا وہ نہایت اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہے،

محرم کی بدعات شنیعہ یعنی مسلمانون کا شیر، ریچھ، بھیڑیے بننا، تاڑی سیندھی کے نشہ مین چور، ہجوم و ہنگامہ آرائیان اور
بدمستیان کرنا، عورتون کی اس مستی مین بے حرمتی کر ڈالنا وغیرہ ایسی سب باتون کی ایسی جڑ کاٹ دی کہ پھر ان باتون کا عود کرنا قطعی
ناممکن ہوگیا، تاڑی او سیندھی پیتے جانا، و اسی حالت مین میلاد خوانی کرنا، دکھنی بھونڈی اردو مین نعت خوانی، بانی مجلس کی تاڑ
و سیندھی دیگران بد بخت میلاد خوانون کو رات بھر تنہا الاپتے چھوڑ دینا اور خود گھر مین جا کر سو رہنا معدوم کر دیا گیا، یہ اس طرح کیا گیا کہ ان
میلاد خوانون کے طائفے صدارت العالیہ مین طلب کیے گئے، انکی جانچ کی گئی، اہل کو میلاد خوانی کی باضابطہ اجازت دی گئی، اور نا اہلون کو مکمل
ممانعت کر دی گئی، سیندھی، تاڑی شراب وغیرہ کی دکانین شہر پناہ سے باہر نکالدی گئین، اور شہر پناہ کے اندر مسکرات کا باہر سے لانا جرم قرار دیا گیا
گئین،

اہالیانِ خدماتِ شرعیہ کا جیسے قاضی وغیرہ احتساب ہوا، امتحان لیے جانے لگے، سندین دی
ان کے لڑکے تکمیل تعلیم دین کے واسطے مدرسہ نظامیہ حیدر آباد مین بھیجے اور دار الاقامہ مین رکھے گئے،
قاضیون کے دفتر از سر نو ترتیب دیے گئے، رویت ہلال کی صحت کا بڑی احتیاط کے ساتھ اہتمام کیا گیا،
مسجدون مین تنخواہ دار امامون کی تعداد مین اضافہ کیا گیا، موذن، جاروب کش، جانمازون، برقی پنکھون
پانی کے نلون، حوضون، طہارت خانون، غسل خانون، بڑی مسجد مین تنخواہ دار خطیبون وغیرہ کا اضافہ کیا گیا،
عیدگاہ میر عالم کی درستی اور توسیع ہوئی، جہان اب بیس بیس ہزار مصلیون کا عید کی نماز مین ہجوم ہونے لگا،
اور اس عیدگاہ کو شروانی صاحب کی صدر الصدوری مین یہ فخر پہلی دفعہ نصیب ہوا کہ اعلیحضرت نظام دکن
میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہٗ نے عید کے دوگانے اسی عیدگاہ مین ادا کرنے شروع کیے، اور امراء

داراکین سلطنت عید کی نماز کو یہان حاضر ہونے لگے، اضلاع مین دینی مدارس اور اصلاحی تبلیغی انجمنین قائم
کی گئین، انگریزی مدرسون مین دینی تعلیم کا خاص نگرانی کے ساتھ انتظام ہوا، واعظین مقرر کیے گئے،
جو اضلاع کے دورے کرتے اور وعظ کہنے کو شہر مدراس تک بلائے جانے لگے، ہفتہ وار مذہبی رسالے
جاری ہوئے، مدارس حفاظ قائم ہوئے، محکمۂ اوقاف کی تنظیم ہوئی، املاک مذہبی سے متعلق اراضیات فیاضی
کے ساتھ لوگون کو دی گئین یا نگرانی سرکار مین لی گئین، مہتمم اوقاف و مساجد کے عہدے قائم کیے گئے،
درگاہون کی آمدنیا خائن متولیون سے نکالی گئین، ماہ صیام مین چائے خانے، آبدار خانے اور ہوٹل دن
مین بند کر دیے گئے، مسلخون مین ذبیحہ کی نگرانی کی گئی، حاجیون کے قافلہ کا خاص انتظام کیا گیا
اور سہولتین بہم پہنچائی گئین، غیر آباد مساجد بند کرکے بے حرمتی سے بچائی گئین، مختصر یہ کہ شروانی
صاحب کی صدر الصدوری مین مذہبی رنگ کچھ ایسا چڑھا کہ ولایت کے تعلیم یافتہ ہائی کورٹ کے
جج اور حکیمون نے ججی کے فیصلون اور مطب کے ساتھ ساتھ مجالس وعظ و میلاد مین خوب خوب تقریرین کین،

شروانی صاحب نے ایسے نازک مذہبی جذبات و تعصبات کے زمانہ مین جبکہ ہر مذہب تمام مذاہب
کے انتظام کی باگ ایسے دانشمندانہ طریقہ سے ہاتھ مین لے کر کام کیا کہ ان کے خلاف کسی مذہبی گروہ کی
آواز بلند نہ ہوئی، اور یہ ان کے عادلانہ انتظام کا کھلا ثبوت ہے،

عادت کی فلسفیت

مذہبی حسن عمل کے ساتھ شروانی صاحب کی عادت مین ایک خاص فلسفیت کا
بھی مجھے تجربہ ہوا ہے، یعنی وہ دکھلاوے اور نمائش کے انسان نہین، کسی فوری جذبہ سے ان مین تبدیلی
نہین ہوتی، اکثر باتین وہ نہایت بے پروائی کی نظر سے دیکھتے تھے، نہ بڑی سے بڑی خوشی کے موقع پر وہ
از خود رفتہ ہوتے نہ بڑے سے بڑے حادثہ یا نقصان پر وہ شکستہ دل اور مغلوب ہوتے تھے، اسی فلسفیانہ
مزاج کی پرواز کا یہ نتیجہ تھا کہ سفر کے بڑے بڑے مصارف، جو بڑے اہتمام سے ہوتے تھے، باورچی خانہ،
روزمرہ کا دسترخوان، اور تمام حیدر آباد کے خانگی انتظامون مین چیخ پکار، غصہ، غضب، اعتراض، اپنی

وجاہت کے اظہار، غرض ایسی کسی بات کا مین نے ان مین نشان تک نہ دیکھا، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مین ان کی ہر ادا پر عاشق ہون، ایک سطحی خیال کا آدمی تو یہ باتین دیکھکر کہے گا کہ "شروانی صاحب مین قوتِ انتظام نہین" لیکن ایک نگاہِ غائر دیکھے گی کہ ان تمامی باتون پر ایک اصل فلسفی کی طرح وہ توجہ نہین کرتے، اور ان کو قابل التفات نہین پاتے، اور شروانی صاحب کو سمجھنے کے لیے بڑی گہری مشاہدہ کرنے والی آنکھ کی ضرورت ہے، تعلیم اسلام ان مین کچھ ایسے عملی طریقہ سے پیوست ہوگئی ہے کہ جن معاملات کو ہم جیسے لوگ منجانب اللہ صرف زبانون سے کہنا سیکھتے ہین شروانی صاحب ان معاملات کے منجانب اللہ ہونے کا یقین رکھتے ہین،

قرون اولیٰ کے مسلمانون کو اگر آجکل کے بگڑے ہوئے لوگ دیکھتے تو ان کو (خاکم بدہن) احمق وخبطی کہتے، اور وہ برگزیدہ لوگ آجکل کے بندگانِ زر اور غلامانِ دنیا کو حیوان مطلق یقین کرتے،

حدیث شریف تو یہ تعلیم دیتی ہے کہ

خدمتگار کا قصور دن مین ستر بار معاف کرو، دولت وہ جمع کرتا ہے جس مین عقل نہین، سب بہتر وہ ہے جس کا برتاؤ اپنے گھر والون سے بہت اچھا ہو، بچون پر مہربان ہو، یتیمون کے سر پر ہاتھ پھیرو، بدزبانی نہ کرو، غصہ سے دور بھاگو، خوش خلقی مسلم کی سب سے اچھی صفت ہے، وغیرہ وغیرہ

جب اس معیار پر ہم شروانی صاحب کو جانچتے ہین، اور پورے چھ سال ایک عیب جو جاسوس کی طرح ان کو دیکھا ہو اور اپنے روزنامچون کی تین جلدین مین نے سیاہ کی ہین، لیکن مجبور ہون کہ فیصلہ شروانی صاحب کے حق مین دینا پڑتا ہے، ہمارا روے سخن ایسے مسلم رئیس کی طرف نہین ہے جو بات بات پر خدمتگارون یا ماتحتون کو اپنے زجر و توبیخ، محاسبہ اور سخت گیری سے خائف و ترسان رکھتا، جرمانے کرتا یا برطرف کرکے اپنے ناچیز وجود کو ایک بڑی ہستی ظاہر کرتا، اور خود فریبی کے مرض مین مبتلا ہے، یا اپنی دولت کی بدولت اخلاقی معصیت کا شکار ہے، اور اس کا ہمسایہ اس کے شر اور دراز دستی

سے امن مین نہین ہے،

رائے کی مضبوطی اور جرأت اخلاقی

حیدرآباد مین مجھے یہ دیکھنے کا موقع ملا ہے کہ چاہے کتنی ہی خطیر و کثیر مالیت کا دیوانی کا مقدمہ ہو لیکن تجویز مین انھون نے پہلی دفعہ جو رائے لکھ دی اس سے پھر نہ ہٹے اور ججون کے اصرار پر کہ ایک فقرے مین ذرا سی تغیر کر دی جائے کہ سب کی رائے کا اتفاق ہو جائے شروانی صاحب نے یہی جواب دیا کہ "رائے ایک دفعہ دیجاتی ہے، تجویز اعلیحضرت معظم کے ملاحظہ مین بھیج دیجائے"، اور اپنی رائے مین جو پہلی دفعہ لکھ دی تھی ذرا بھی تغیر و تبدیل نہ کی، ایسا تار حبیب گنج سے حیدرآباد کے ججون کو حسب الحکم مین نے خود دیا تھا، اخلاقی جرأت کا یہ حال دیکھا ہے کہ سات لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا مقدمہ ہے، فریقین مین ایک طرف تو اعلیحضرت معظم کے خاص اسٹاف کا بڑا حضوری افسر ہے، اور دوسری طرف ایک ناچار بیوہ ہے، یہ مقدمہ پہلے اس بڑے درباری کے حق مین اس طرح فیصل ہو چکا ہے کہ بیس مفتی علما بیوہ کے خلاف فتاوی لکھ چکے ہین، درباری افسر کو ڈگری مل چکی ہے، لیکن اب وہ پرانی اور بھاری مثل، اعلیحضرت آخری توثیق کی غرض سے شروانی صاحب کو بھیجتے ہین، شروانی صاحب تجویز لکھتے ہین، اور بصیغۂ راز وہ تجویز مجھے دی جاتی ہے مین اسے صاف کرتا ہون اور تجویز پر شروانی صاحب کے دستخط لیکر سربمہر لفافہ مین یہ تجویز مع مثل کے اعلیحضرت معظم کو بھیجدیتا ہون، تجویز یہ لکھی گئی ہے کہ بیسون فتاوی پر جو اسٹاف افسر کے موافق مفتیون نے لکھے تھے، مدلل تردید کا قلم پھیر دیا جاتا ہے، اسٹاف افسر ہرایا جاتا ہے، بیوہ کے حق مین ڈگری دیجاتی ہے، نہ بیس فتاوی کا لحاظ فرمایا جاتا ہے، نہ اسٹاف افسر کی وجاہت و مروت راہ انصاف مین حائل ہوتی ہے، نہ اسٹاف افسر کا خوف ہے کہ دربار سلطانی کا ہر وقت کا حاضرباش ہے، آخر فقرہ اس تجویز کا یہ تھا "شرعی حکم تو یہ ہے، آیندہ اختیار سلطانی" بعد کو معلوم ہوا کہ اعلیحضرت نے اسی تجویز پر عمل فرمایا، جو شروانی صاحب نے دی تھی، گذارش یہ ہے کہ بیس فتاوی کی تردید کسی معمولی فقیہ کا

کا کام نہین، نہ ایک ہندوستانی دربار مین ایسی جرأت اخلاقی آسان ہے،

جب کسی کی سرکار عالی مین شروانی صاحب نے سفارش کی تو اپنی صائب رائے سے استحقاق کو ایسا ملحوظ رکھا کہ وہ سفارش کبھی نامنظور نہ ہوئی، ہان، ایک دو مثالون مین ایسا ضرور ہوا کہ شروانی صاحب نے مثلاً تیس روپیہ ماہوار کی سفارش کی تو اعلحضرت معظم نے تیس کو پچاس فرما دیا، لیکن تیس کو پچیس یا بیس کبھی نہین کیا

کیسی ہی بڑی سفارش کے ساتھ، کیسی ہی رایون یا تقریظون سے آراستہ کوئی تالیف و تصنیف قلمی شروانی صاحب کے پاس آئے جس کے متعلق مؤلف یا مصنف کو سرکار عالی کی سرپرستی، انعام یا وظیفہ کی بڑی توقع ہو لیکن وہ کتاب ناقص ہو، تو شروانی صاحب کبھی تو ایسا کرتے کہ اس پر رائے لکھتے ہی نہ تھے، انکار کر دیتے تھے، لیکن اگر لکھتے تو اس کتاب کے نقص نکال کر دکھا دیتے تھے، اور سفارشون یا تقریظون کا مطلق لحاظ نہ کرتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سب سے زیادہ لایق عالم تقریظ نگار کو بلا کر وہ کتاب اس کے سامنے رکھ دیتے اور پوچھتے تھے کہ ایسی ناقص کتاب پر یہ تقریظ اس نے کس طرح لکھی، اور تقریظ نگار کو معذرت کرنی پڑتی، کہ مؤلف کتاب نے اس کو جان سے تنگ کر دیا تھا،

قدرت کی صنعت کاری کا اثر | اس عنوان مین سب سے پہلے یہ دکھانا ہے کہ کوئی عمدہ شعر ہو شروانی صاحب پر وجدانی حالت طاری کر دیتا تھا، یہ کلیہ یاد رکھنے کا ہے کہ حساس دل پر شعر کا اثر ہوتا ہے، اور ایسا ہی دل اخلاقِ حَسَن کا گنجینہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے،

اس سے اخلاقِ حُسنٰ کی کیا توقع کیجیے، شعر سے یعنی نہ جس بے حِس کو لذت آئے ہر

شعر بھی نیچر کی سحرکاریون مین سے ایک سحرکاری ہے، اسی شاعرانہ طبیعت کا انسان تیز محسوسات رکھتا ہے، پھر عیب و ہنر، نیکی بدی، جھوٹ سچ سب ہی باتون کا اسے احساس ہوتا ہے، حسن و قبح سے وہ متاثر یا متنفر ہوتا ہے، کسی بے حس دل کو پتھر کا ڈول سمجھو اور ایسے دل والے سے کوئی توقع نہ رکھو

یہ بے حسی ہی تو ہے جو آدمی کو کنجوس، فریب کار، بے حیا، سنگدل، کذاب، ریاکار، نمائشی یا ابن الوقت بنا دیتی ہے، خودداری اس سے معدوم کر دیتی اور صرف جاہ طلبی اس کا نصب العین بنا دیتی ہے،

چنانچہ فطرت کی صنعت کاری کا اثر جو مین نے خود شروانی صاحب پر دیکھا ہے یہ ہے کہ وہ بھونگیر کے دورے مین جاتے ہین، مین ساتھ ہون، بھونگیر کے آسمانی قلعہ پر جو صرف ایک پتھر کی چٹان پر کسی پرانے زمانہ مین تعمیر کیا گیا تھا صرف تفریح اور تاریخی تحقیقات کی غرض سے پہنچنے کو، اس رفیع الشان چٹان پر ہم چڑھنا شروع کرتے ہین، راہ مین ٹھہرتے اور دم لیتے جاتے ہین، آخر مین جب ہم بڑی بلندی پر پہنچے مین شروانی صاحب چٹان کے ایک شگاف مین پانی بھرا پاتے ہین جس مین نیلوفر کے صرف دو پھول کھلے ہوئے ہین، یہ پھول دیکھتے ہی شروانی صاحب پر عجیب حالت طاری ہو جاتی ہے، وہ اس بلندی، پہاڑی کی خشکی، پھر یہان پانی، پانی مین نیلوفر، نیلوفر کی شادابی پر حیرت مین ڈوب جاتے ہین، ان کا برقی خیال صانع حقیقی کی قدرت اور صنعت کی طرف جا پہنچتا ہے، وہ اس مقام پر ٹھہر جاتے اور اسی مبحث پر عجیب مؤثر پیرایہ مین گفتگو کرتے ہین،

حبیب گنج کے اپنے بے نظیر باغ کے چمن مین وہ ٹہل رہے ہین، جنوری کا مہینہ ہے، گلاب ایسا کھلا ہوا ہے، کہ چمن مین گویا آگ لگ رہی ہے، بس وہ کسی شاداب پھول، اس کے گہرے، ہلکے رنگون اور اس کی نزاکت پر غور کرتے، اور صانع حقیقی کے کمال اور قدرت کے خیال مین غرق ہو جاتے ہین، پھر مجھکو ایک ایک بارکی اور مصورِ قدرت کی قلم کاری سمجھاتے ہین، اور اسی حال مین سودا کا یہ شعر پڑھتا ہون ؎

رنگِ گل بے طرح دہکے ہے اس لے ابر بہار، آشیان میرا پھڑک، لگتی ہے اب گلشن کو آگ

چمن کے قطعی حسب حال یہ شعر سنکر ان کا دل ایک اضطراری ولولے سے بھر جاتا ہے، کسی سایہ دار درخت، کسی پتے، کسی پھل مین بس فوراً صانعِ حقیقی کی قدرت گویا شروانی صاحب پڑھنے لگتے تھے،

ہم کو سہسوان کے وسیع کھیتون کے کنارے بھی کھڑے ہونے کا اتفاق ہوا ہے، جہان تک نظر جاتی ہے زرد پھولون کا ایک زعفران زار ہے، نظر لوٹی جاتی ہے، لیکن سب سے زیادہ روحانی لذت اس سے شروانی صاحب ہی کو ہوتی ہے، کیونکہ جمال مین وہ جمال آرا کا مشاہدہ فرما رہے ہین،

حیدرآباد کی کوٹھی امید منزل کے حاطہ مین عزیزی عبد الوحید خان نے چھرّے سے ایک دفعہ ایک چڑیا ماردی، ایسی حسین چڑیا ادھر شمالی ہندوستان مین نہین ہوتی، اس شہید بے گناہ کو شروانی صاحب نے دیکھا، اور انھون نے ایک عجیب انداز سے فرمایا "وحید! کس دل سے تم نے اسے مارا، کیا اس کا حسن بھی اس کا سفارشی نہوا، کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ قدرت کا یہ حسین نقشہ کوئی یون مٹادے"

یہ ذرا ذرا سی باتین ہین جو نہ اب عبد الوحید خان کو یاد رہی ہون گی، نہ شروانی صاحب کو خیال رہا ہوگا، لیکن میرا جاسوس روزنامچہ اس حسین چڑیا کی شہادت پر ہمیشہ مرثیہ خوان رہے گا، اور شروانی صاحب کی رقیق القلبی پر گواہی دے گا، مختصر یہ کہ مین نے شروانی صاحب مین ایسی ایسی پاک صفتین دیکھی ہین کہ جنکی غالباً ان کو خود خبر نہین، اور اگر اپنے روزنامچون سے ان کی پوری تفصیل کرون تو یہ اعتراف ایک بڑی کتاب بنجائے گا،

اور قو اور شروانی صاحب کا طریقۂ تعلیم خیرات تو دیکھو کہ غریب بچون کو حبیب گنج کی گڑھی مین وہ خود اپنے ہاتھ سے پیسے نہین بانٹتے بلکہ اپنے چار برس کی عمر کے پوتے سے یہ پیسے بٹواتے ہین، یعنی پوتے کو خیرات دینے کی تعلیم گھوارے مین دیجاتی ہے، مرحبا۔

نمود و نمائش سے نفرت اور عام اخلاق شروانی صاحب کو دواجی شہرت کی نہ آرزو ہے نہ جستجو، اس کی کثرت سے مثالین مین نے دیکھی ہین، یعنی جب بڑے صاحبزادے آنریبل محمد عبید الرحمن خان سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی ہوئی تو یہ شادی بڑے اونچے پیمانہ پر ہوئی تھی، لیکن کسی انگریز کو دعوت یا گارڈن پارٹی مین مینے نہ دیکھا، شمس العلماء کا خطاب انھون نے نہ لیا، اور سرکاری تجویز ابتدا ہی مین نامنظور

کردی، سرکار آصفیہ کے خطاب "نواب صدر یار جنگ" کی انھون نے اس لیے قدر کی کہ اسلامی سرکار سے اس کا واسطہ تھا، اور مذہبی نقطۂ نظر اس موقع پر ملحوظ تھا، حقیقی شہرت کا صحیح مفہوم وہ سمجھتے ہین احسان کرکے نہ احسان جتاتے ہین، نہ محسن کے بے کبھی تیور اختیار کرتے ہین، تعلیم اسلام کا ان پر گہرا عملی رنگ چڑھا ہوا ہے، کتب سیر، اور احادیث مین شمائل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انھون نے بے کار مطالعہ نہین کیا ہے، صرف ادائے فرض اور مخلوق کے ساتھ بھلائی ان کی زندگی کا مقصد ہے جس مین ریا اور نمایش کو دخل نہین اور اس زمانہ مین سب سے بڑی اور سچی یہی تعریف ہے جو کسی کی جا سکتی ہے، ان کی نیکیون مین ایسی قوت ہے کہ "اہل" ہم نشین پر اپنا رنگ چڑھا دیتی ہین اور یہ بات شروانی صاحب کے اخلاص اور صداقت کا بین ثبوت ہے،

آخر مین یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ شروانی صاحب بھی صرف ایک انسان ہین، فرشتہ نہین، دنیا مین جتنی بڑی ہستی کا انسان ہوتا ہے، اسی قدر اس کی طرف نگاہین اٹھتی ہین، اس گروہ مین ایک بھی انسان ایسا ہم کو تاریخ مین نہین ملتا جس کو سب نے اچھا کہا ہو، اچھے انسان کی یہ پہچان ہے کہ اسے صاحب تمیز، انصاف کی اہلیت رکھنے والے، و بے غرض، لوگ اچھا کہین، انسان کسی دوسرے انسان کو اکثر اپنے ذاتی جذبات یا اغراض کی عینک سے بھی دیکھا کرتا ہے، اور کبھی اغراض، رشک و حسد یا خود اپنے نفس کی خباثت سے یہ عینک غبار آلود ہوجاتی ہے، جس سے نورانی چیزین صاف نظر نہین آتین بلکہ دھندھلی اور گرد آلود نظر آتی ہین، پس خطا نورانی چیزون کی نہین ہوتی، تقصیر غباری عینک کی ہوتی ہے، چنانچہ اس اعتراف مین جس پہلو کی شروانی صاحب کی تصویر نہایت دیانت و راستی سے دکھائی گئی ہے، وہ ناظرین کے سامنے ہے، اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اب ناظرین دوسرے دولت والے امیر، کبیر مسلمانون سے جن سے ناظرین اچھی طرح واقف ہون شیروانی صاحب کا مقابلہ کرین اور اگر یہ مقابلہ و موازنہ کرنے والے انصاف

فرمائین گے، تو ضرور ایک سبق آموز نتیجہ پر انشاء اللہ تعالیٰ پہنچ جائین گے،

آخر مین نازک خیالون سے میری یہ گزارش ہے کہ مین نہایت تنہائی پسند اور قریب قریب وحشی انسان واقع ہوا ہون، امراء کے پاس حاضر ہونے کو بہت سے عقلمند موجب فخر یقین کرتے ہین، لیکن مین امراء سے بہت ڈرتا ہون، شروانی صاحب میری یہ عادت اچھی طرح جانتے ہین، میری سادہ لیکن نہایت مصروف زندگی انھون نے خوب دیکھی ہے، صرف اداے فرض کو مین نے خوشامد کا قائم مقام یقین کیا ہے،

لیکن اس بیگانہ روش پر شروانی صاحب نے مجھ پر بڑی بڑی مہربانیان فرمائی ہین، پس یہ اعتراف صرف دو وجوہ سے مین نے لکھا ہے کہ کچھ تو اداے شکر گزاری کا فرض پورا ہو جائے، اور دوسرے ناظرین یہ دیکھین کہ بڑے نفس وعلم اور مرتبہ اور دولت کا اصل مسلم کیسا ہوتا ہے، امراء کو مین اپنی طرح عاجز اور درماندہ سمجھتا ہون جنکو میری ہی طرح بھوک پیاس لگتی ہے، اور میری طرح ان کے درد سر بھی ہو سکتا ہے، اور یہ مین نے شروانی صاحب سے سیکھا ہے، جنھون نے حیدر آباد کی ایک عظیم الشان مجلس مین اپنی تقریر کے درمیان فرمایا تھا "صاحبو! اپنے نفس سے محاسبہ کرنے کی عادت ڈالو، یہی تم کو بتلائے گا کہ تم جس قدر بڑا اپنے تئین خیال کرتے ہو اسی قدر زیادہ تم درماندہ، عاجز اور محتاج ہو، یہی عادت آدمی کو انسان بناتی ہے، اور یہی اسلام کی تعلیم ہے"؛

دار المصنفین کی نئی کتاب

امام رازی

امام فخر الدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضہ تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس مین ان کے سوانح وحالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ وعلم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق انکے نظریات وخیالات کی تشریح کیگئی ہے، جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور وفکر کرنا چاہتے ہین ان کیلئے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دیسکتی ہے

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت: ٤ روپے

"منیجر"

مولینا شروانی کی تصویر ان کی تحریر کے آئینہ مین

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم ہماری پرانی تعلیم وتہذیب کے ان نمونون مین تھے جن کی مثال اب نہ ملے گی، ان مین علم وعمل، دین وتقوی، اخلاق وشرافت، وقار ومتانت وغیرہ قدیم تعلیم وتہذیب کی تمام خوبیان اور وضعداریان جمع تھین،

وہ صاحب علم، علم دوست، علماء نواز اور علم وفن کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے، ان کی ساری زندگی علمی وتعلیمی خدمات ومشاغل مین گذری، سرسید کے زمانہ سے لے کر موجودہ دور تک وہ مسلمانون کی تمام مفید علمی، تعلیمی اور اصلاحی تحریکون کے حامی ومددگار رہے، کوئی اسلامی ادارہ ان کی علمی واخلاقی امداد سے محروم نہ تھا، اسلامی علوم وفنون اور مسلمانون کی علمی تاریخ اور قدیم تہذیب سے ان کو عشق تھا، ان سب کی تفصیل ایک مضمون مین سما سکتی ہے، اور نہ ہمارا مقصود ہی، یہ مرحوم کے ان رفقاء اور معاصرین کا کام ہے جن کو ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، راقم کو صرف دو چار مرتبہ مختصر ملاقات کا موقع ملا ہے، اس لئے وہ اس پر کچھ بھی نہین لکھ سکتا، البتہ مرحوم کی تصانیف اور تحریرین برابر نظر سے گذرتی رہین، جن مین ان کے بہت سے خیالات ورجحانات اور خصوصیات کی جھلک نظر آتی ہے، اس مضمون مین اسی آئینہ مین ان کی تصویر دکھانے کی کوشش کی جائے گی،

ان کی دینی اور قدیم تعلیم سے دلچسپی — مرحوم پرانی تعلیم کی یادگار اور عالم باعمل تھے، اس لئے عربی اور دینی تعلیم سے

اُن کو بڑی دلچسپی تھی، اور انھون نے علمی و عملی دونون حیثیتون سے اُس کی خدمت کی، وہ شروع سے دارالعلوم ندوۃ العلما، کے معاون و مددگار رہے، انجمن ترقی عربی الٰہ آباد کے سرپرست، اور دوسرے عربی مدارس کے ہمدرد و ہوا خواہ تھے، مسلمانون کی قدیم تعلیم اور اُس کے نصب العین پر ایک رسالہ لکھا ہے، جس مین مذہبی نقطۂ نظر سے تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، یہ رسالہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے،

دارالعلوم ندوۃ العلما کے اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت مین دینی تعلیم کے متعلق یہ خیالات ظاہر کئے ہین

"ہمارے علما، کی یہ شان رہی ہے، کہ انھون نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا، علوم دینیہ سے انھون نے خدا اور رسول کی خوشنودی مقصود رکھی، علوم دنیویہ (جس کو بہت کم ذریعۂ جاہ و حشمت بنایا) اس کی خدمت بھی بحیثیت علم کرتے رہے، یہ واقعہ زرین تاریخ کا کارنامہ ہے کہ جب بغداد مین مدرسۂ نظامیہ قائم ہوا، اور وہان علما کے گران قدر مشاہرے اور طلبہ کے بیش قرار وظائف اور سامان آسایش مہیا کئے گئے، تو علمائے بخارا نے علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور رو کر کہا کہ اب علم علم کے لئے نہین بلکہ جاہ و حشمت کے لئے حاصل کیا جائے گا"

(مقالات شیروانی ص ۲۰۴)

مسلمان علما کے حالات مین علمائے سلف اور ابنائے علما، دو کتابین لکھین، اول الذکر مین علمائے سلف کے دینی، تعلیمی اور اخلاقی و معاشی حالات و واقعات تحریر کئے ہین، جس کا اندازہ حسب ذیل عنوانون سے ہوگا،

طلب علم افلاس و تنگدستی و دشواریان، سفر کی مشقتین، کتابون کی نقل و کتابت، توجہ کامل، اور شوق طلب، حفظ و استحضار علمی، علم کی حرص، اس کی راہ مین صرف، مسلمانانِ سلف کا علمی ذوق، امرا مین علم کا ذوق،

اختلاف و اتفاق تمہید، (جس مین یہ ذکر ہے کہ مذہبی نزاع کو سلف صالحین کیسا سمجھتے تھے! اختلافات صحابہ کے زمانہ مین علمائے اہل سنت و جماعت کا برتاو، مخالف عقیدہ کے علما، کیساتھ مختلف مذہب کے علمائے اہل سنت کا آپس مین برتاو، جب نزاع کا دروازہ کھل گیا، تو خود علمائے اہل سنت

جماعت باہم کس طرح مخالف ہوگئے،

حق پسندی و راست گوئی حق پسندی حکام کے مقابلہ مین، معاصرین و ہم چشمون کے مقابلہ مین، اپنے نفس کے مقابلہ مین،

حسنِ معاشرت کسب معاش، تجارت، حرفت، تمول، علما کے تعلقات، سلاطین کے ساتھ، اُن کا اثر سلاطین پر، ملک پر، مخالف فرقون کی محبت علما کے ساتھ، غیر مذہب کے لوگون کی محبت علما کیساتھ، علما کی معاشرت کے بعض امور، حالات، لباس، جسمانی ریاضت، اپنا کام خود کرنا،

ان عنوانات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب مین قدیم تعلیم کے تمام اہم اور ضروری پہلوؤن علما کی حیثیت ان کے فرائض، ذمہ داریون اور ان کے اصلاح طلب اُمور کی پوری تفصیل آگئی ہے،

تعلیم جدید مین دینی روح کی ضرورت

مرحوم زمانہ کے حالات و ضروریات کے پیش نظر جدید تعلیم کے بھی حامی تھے، اور ابتدا سے علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کے معاون و مددگار اور اس کے رکن رہے، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، کچھ دنون تک جامعۂ عثمانیہ کے وائس چانسلر بھی رہے، لیکن اُن کا دینی جذبہ جدید تعلیم مین بھی مذہبی روح دیکھنا چاہتا تھا، اس لئے وہ سر سید احمد خان کی تعلیمی و اصلاحی کوششون کے معترف و مداح اور ان کے معاون و مددگار رہے، لیکن اُن کے مذہبی خیالات سے اُن کو سخت اختلاف تھا، اور علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی مذہبی حالت سے وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہے، اس کا ثبوت ان کی مختلف تقریرون اور تحریرون سے ملتا ہے، حیاتِ جاوید کے ریویو مین اس کی پوری تفصیل موجود ہے، اس مین انھون نے سر سید احمد خان کے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے اختلافات تفصیل سے ظاہر کئے ہین، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقالات شروانی ص ۴۰۸)

اسی ریویو مین کالج مین مذہبی تعلیم کی جانب سے بے توجہی پر بھی اظہار تاسف کیا ہے مولانا حالی نے حیاتِ جاوید مین یہ بھی تحریر کیا ہے کہ کالج مین مذہبی تعلیم کا بڑا اہتمام تھا، مولانا شروانی اس اہتمام کے لفظ

مسلم یونیورسٹی مین اسلامی آرٹ کے سلسلہ مین ایک تحریر مین لکھتے ہین،

"اسلامی آرٹ کا مفہوم تفصیل طلب ہو، سبسے بڑا اسلامی آرٹ وہ حسین زندگی ہے، جو عالم انسانی مین خالق جمیل کے جمال کامل کے پرتو سے جلوہ فرما ہوئی، اسلام ہی نے مخلوق کو بلا واسطہ خالق کے سامنے بٹھا کر یہ حسن و زیبائی پیدا کی حبیب کبریا روحی فداہ کی حیات حسن وجمال سے لبریز ہے اور اسلامی آرٹ کا اشرف، اعلیٰ نمونہ اس کے بعد قرآن مجید اور خالص اسلامی علوم ہین، پھر اسلامی تاریخ ہے، جو دلون پر تصرف و فرمانروائی کی دلکش مثالون سے معمور ہے۔۔۔۔ اس کے بعد شاعری ہے پھر عمارت و صنعت ہے پھر خطاطی، سب سے آخر مین مصوری چونکہ تصویر بنانا شرعاً ممنوع ہے، اس لئے کمتر طبیعتین اس کی جانب مائل ہوئین، مگر اہل کمال نے حرفون کے نقوش مین عالم تصویر دکھایا، ایک استاد کا قطعہ ایک ہنر بین کی نگاہ مین وہی ذوق بخشتا ہے، جو ایک کامل مصور کی تصویر" (مقالات شروانی ص ۲۵۳)

اُن کی دوسری تقریرون اور تحریرون مین بھی اس قسم کے خیالات بکثرت ملتے ہین، لیکن ہمارا مقصد صرف ہر پہلو کی جھلک دکھانا ہے، اس لئے تفصیل مین نہ پڑین گے،

مسلمانون کی علمی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون سے ذوق و شغف

اسلامی علوم وفنون اور مسلمانون کی علمی تاریخ سے والہانہ شیفتگی تھی، اور اُس پر انکی نگاہ نہایت وسیع تھی، اُن کی کوئی تقریر و تحریر مشکل ہی سے اس تذکرہ سے خالی ہوتی تھی، ندوۃ العلماء کے اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت مین مسلمانون کی علمی تاریخ پر مختصر اور جامع تبصرہ ہے، فرماتے ہین:۔

"اسلام جب سرعت و قوت سے پھیلا، اسی سرعت و قوت سے علم کا شوق مسلمانون کے دلون مین ترقی کرتا گیا، پہلی صدی ہجری مین ممالک اسلامیہ دار العلوم بن گئے، اس مین کسی قوم یا رنگ کی خصوصیت بھی نہ تھی تابعین ہی کے طبقہ مین عرب کی جگہ عجمیون نے لے لی تھی، امام مکحول، عکرمہ، امام ابو حنیفہ وغیرہ ائمہ جلیل القدر عجمی تھے، حدیث مین ارشاد ہے، الحکمۃ ضالۃ المؤمن حیث وجدھا اخذھا، اس گم شدہ

پر تحریر فرماتے ہین،

"جو حالت مذہبی تعلیم کی کالج مین عہد سر سید مین رہی، مین نہین سمجھتا کہ اس پر اہتمام کا لفظ کس طرح صادق آسکتا ہے۔۔۔۔۔ افسوس ہے کہ سر سید کے عہد ٹرسٹی شپ اور مسٹر بیک کی پرنسپلی کے زمانہ مین کالج مین جو چیز سب سے زیادہ غیر مہتم بالشان تھی، وہ مذہبی تعلیم تھی، بجائے اس کے کہ اس کی تربیت سے مذہب کی خدمت ذہن نشین ہوتی، اور وہ ایک عمدہ پالیسی کے پیرایہ مین دماغون مین جاگزین ہوتا، ہماری سمجھ مین نہین آتا، کہ کالج کی جس مذہبی تعلیم کو سراہا جاتا ہے، وہ کیا چیز تھی، سر سید تحریر و تقریر مین ہمیشہ مذہب کے سرگرم حامی رہے، لیکن عالم عمل مین آئے تو معلوم نہین ہوتا کہ وہ مذہب کیا تھا جس کے وہ حامی تھے"

(مقالات شروانی صفحہ ۹۶)

نان کوآپریشن کے زمانہ مین ٹرسٹیون کے ایک جلسہ مین کالج کے طلبہ کی مذہبی لاپروائی پر ان الفاظ مین تاسف کا اظہار کیا ہے،

"حضرات مین علی گڈھ اس خوشی کے خیال کو لے کر آیا تھا کہ حالیہ تحریک (نان کوآپریشن) کے اثر سے کالج کے طلبہ مین مذہب کا جلوہ دیکھون گا، جس کی تمنا برسون سے دل مین تھی اور جو باوجود گوناگون کوششون کے اب تک حاصل نہ ہوسکا، لیکن حالات دیکھ کر مایوسی ہوئی۔۔۔۔۔ رات مین نے عشا کی نماز کالج کی مسجد مین جماعت کے ساتھ پڑھی میرا خیال تھا کہ اب جب کہ مذہبی روح طلبہ مین سرایت کر چکی ہے، (نان کوآپریشن کے اثرات مراد ہین) تو ایک دیرینہ آرزو پوری ہوگی، اور کم از کم ایک پوری صف مین طلبہ کو دیکھون گا، مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی،

حضرات! اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور جب تک دنیا مین قائم ہے، اسلام بھی قائم رہے گا، وہ زندگانی کا ایک خاص قانون لایا ہے، جس کی پابندی عملاً ہر مسلمان پر واجب ہے"۔ (مقالات شروانی ص ۲۱۹، ۲۲۰)

کی تلاش مین مسلمانون نے دنیا کا کوئی گوشہ نہین چھوڑا، جہان سے خزانۂ علم حاصل نہ کیا ہو، کوئی علمی زبان نہین چھوڑی جس کا سرمایہ عربی مین منتقل نہ کیا ہو ۔۔۔۔۔ جن ممالک مین مسلمان گئے، علم اور علم کا شوق ساتھ لیتے گئے، حجاز، شام، یمن، عراق، ماوراء النہر، ایران، خراسان، کابل، ترکی، مصر، تونس، مراکو، اندلس، چین، صقلیہ اور بحر روم کے دوسرے جزائر، جاوا وغیرہ، شرق الہند کے جزائر، ہندوستان، غرض وہ کون ملک تھا، جہان مسلمان گئے، اور وہ دار العلوم نہ بن گیا، اُن کے شہر اور قصبے درکنار گاؤن تک مرکز علوم بن گئے، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، بغداد، اصفہان، نیشاپور، ہرات، طوس، دہلی، لکھنؤ، قیروان، قرطبہ، قاہرہ، قونیہ، بیت المقدس، بخارا، سطح ارض پر کہان کہان بکھرے ہوئے ہین، لیکن ان مین سے جس مقام پر جاکر گوش عبرت سے سنئے گا، ذرہ ذرہ کی زبان پر علوم اسلامیہ کا تذکرہ پائے گا، (مقالات شیروانی ص ۲۰۱)

یہ اس خطبہ کا ایک اقتباس ہے، خطبہ مین اس اجمال کی تفصیل پر نظر ڈالی گئی ہے، اُن کی بعض تصانیف اور بیشتر مضامین اسلامی علوم کی تاریخ سے متعلق ہین، خود علمائے سلف سے اسلامی فنون کی تاریخ کے بہت سے گوشون پر روشنی پڑتی ہے،

مسلمانون کی علمی دولت کی بربادی کا ماتم

ہندوستان مین مسلمانون کی حکومت کے زوال کے ساتھ، اُن کے علم، دولت اور اعمال و اخلاق پر بھی زوال طاری ہو گیا تھا، اور نا اہل اخلاف کے ہاتھون اسلاف کرام کا علمی خزانہ بھی تلف ہونے لگا تھا، ہزارون بیش بہا قلمی اور نادر کتابین کوڑیون کے مول بک کر یورپ پہنچ گئین، جو کچھ بچا کھچا سرمایہ باقی رہ گیا تھا، سر سید احمد خان نے اس کے تحفظ کی جانب توجہ کی تھی، چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد مین نادر قلمی کتابون کی تلاش اور اُن کی حفاظت بھی تھی، لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا، کانفرنس کی باگ جب مولانا شروانی مرحوم کے ہاتھون مین آئی، تو انھون نے دوبارہ اُس کی جانب توجہ کی، اور ۱۹۱۵ء مین قلمی کتابون کی حفاظت یا علمی خزانون کی بربادی کے عنوان سے ایک درد انگیز اپیل شائع کی، یہ اپیل بہت طویل ہے، اس کے بعض اقتباسات یہ ہین،

ہندوستان مین سلطنت مغلیہ کے زوال اور بربادی کے ساتھ ساتھ جہان مسلمانون کی دولت و ثروت کا خاتمہ شروع ہوا، اُن کی جاگیرین، زمینداری اور علاقے برباد ہوئے، اُن کی اخلاقی اور دماغی قوتین بھی فنا ہونا شروع ہوئین، اسی کے ساتھ ساتھ علم و فضل اور تحصیل علوم کا سرمایہ یعنی بیش بہا کتاب خانے جو جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی تھے، تباہ ہونا شروع ہوئے،

جو اسلاف مسند علم کی زینت دینے والے تھے، اُن کے اخلاف اور قائم مقام ایسے ہوئے جنھون نے ان انمول موتیون کی سنگریزون کے برابر بھی قدر نہ کی، غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو ابھی پون صدی بھی نہین گذری، اہل بصیرت کو اس کا علم ہے کہ اس زمانہ مین شہر تو شہر صدہا قصبے بھی ایسے تھے، جہان یہ علمی سرمایہ بہت کچھ موجود تھا، دہلی، لکھنؤ، لاہور، پٹنہ، آگرہ، سورت، احمد آباد، بنارس، بلگرام، کاکوری، پانی پت، مارہرہ، امروہہ، اور مثل ان کے بہت سے مقامات تو گویا اس بازار علم و فضل کے شاہ در تھے، جس مین متاع حدیث، فقہ، تفسیر، منطق، معانی، تاریخ، طب، حکمت و فلسفہ، اور عربی و فارسی ادب کی کتابین، نامی شعراء کے دواوین، قلمی بے بہا نسخون، مشہور خطاطی کے استادون کے قطعات اور قلمی مرقعون کی شکل مین انبار کے انبار نظر آتے تھے، اُن کے مکانات کی الماریان اور بڑے بڑے صندوق ان جواہرات سے معمور تھے،

کتاب خانے ایک طرف رہنے کے مکانون کا یہ عالم تھا کہ جہان آج مکانات کی زینت اور آرائش مین یورپ کی نت نئی اشیاء نے جگہ حاصل کی ہے، وہان اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تک مسلمانون کے دیوان خانون اور گھرون کے معمولی سے دالانون کی آرائش مین جو چیزین دیگر اشیاء نمائش مین نمایان نظر آتی تھین، وہ ان خوش نویس صاحب کمال خطاطون کی وصلیان اور طغرے ہوتے تھے، جن مین نہایت پر معنی اور پر کیف متین پر نصیحت قطعے، پر اخلاق جملے، دل آویز فقرے، احادیث شریف اور کلام پاک کی آیات مبارکہ کے پر تاثیر جملے اس خوبی اور کمال تحریر کے ساتھ چوکھٹون مین رکھ کر آویزان کئے جاتے تھے، جن کے در و دیوار سوتے جاگتے، اخلاق آموزی، حکمت پژوہی، اور خوبی مذاق کی طرف زبان حال سے تعلیم دینے مین مصروف

رہتے تھے، اس دستور کی وجہ سے صدہا اقوال مسلمانوں کے علمی لٹریچر کی جان بن کر جاہلوں تک کی زندگی
کا دستور العمل بن گئے،

جن علمی جواہرات کو ہماری جہالت نے خزف ریزوں کی طرح پامال کرنا شروع کیا، یورپ نے اپنے
دامنِ امید میں ان موتیوں کو بھرنا شروع کیا، آج بڑے سے بڑے مسلمان عالم کی نادر و نایاب کتابوں
کا مسلمانوں کے علوم و فنون سے دلچسپیوں کا، بڑے بڑے مسائل علمی پر اُن کی مجتہدانہ و محققانہ موشگافیوں کا
میدان علم کی تلاش و جستجو میں اُن کے پرمغز کارناموں کا پتہ لگانا چاہو تو اس کا نشان یورپ کے سوا
کہیں اور نہیں ملے گا، جب قوم میں قومی علوم کی یہ قدر افزائی رہ جائے تو پھر قومی خصوصیات کا ذکر
اور اس کی بقا کی امید ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، جب اُن کے کتب خانے اپنے
معلمانِ اخلاق کی تصنیفات سے خالی ہوں گے، تو اس جذبہ اور کیفیت کی تلاش تحصیل حاصل ہے کہ
کبھی ہماری قوم بھی علوم و فنون کی دنیا میں اخلاق پھیلانے کی اور تہذیب و شائستگی کو اس عالم میں
رواج دینے کی کفیل تھی، اور ہم نے بھی یہ سبق عالم کو پڑھایا تھا،

ایسی کوشش جو مسلمانوں کے قدیم قلمی و علمی ذخیرہ کو فنِ خوشنویسی اور خطاطی کے کمال کو اُن کی
انشا کے طور و طریق کے نمونوں کو قدیم فرامین کو آیندہ کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھ سکے، جہانتک
میری محدود معلومات کا ذریعہ ہے کسی ذمہ دار جماعت کے اہتمام سے اب تک باقاعدہ طور پر عمل میں
نہیں لائی گئی، اور نہ اس وقت تک لائی جارہی ہے، لہذا اس کی حفاظت کی تدبیر عملاً اختیار کرنے کا
وقت حد سے زیادہ گذر چکا ہے، اور ضرورت اس امر کی ہے کہ بقیہ نقیہ جس طرح بن پڑے سمیٹ کر رکھا
کیا جائے، اور اس کو درست حالت میں رکھنے کی توجہ کے ساتھ کوشش شروع کی جائے"۔ (مقالات
ص ۲۲۲ تا ۲۲۴)

یہ اپیل بہت طویل ہے، مذکورۂ بالا عبارت محض اس کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے

کہ مرحوم کو اسلامی علوم و فنون کے ساتھ کتنا شغف اس کی بربادی کا کتنا غم اور اُن کے تحفظ کا کتنا خیال تھا،
گو یہ اپیل بھی زیادہ کارگر نہیں ہوئی، لیکن انھوں نے خود اپنی محنت تلاش سے بڑی دولت صرف کرکے
نادر اور قلمی کتابوں کا بڑا بیش قیمت ذخیرہ جمع کیا، اور اُن کا ذاتی کتب خانہ قلمی اور نادر نسخوں کے اعتبار
سے ہندوستان کے بہترین کتب خانوں میں ہے،

پرانی تہذیب اور قدامت و وضعداری سے شیفتگی

علمی ذوق و شوق کے بعد مرحوم کی زندگی کا نمایاں پہلو قدامت و وضعداری ہے
وہ خود قدیم تہذیب کا نمونہ تھے، اور اسی کا جلوہ وہ مسلمانوں کی تہذیب و
معاشرت میں دیکھنا چاہتے تھے، اُن کی تحریریں اس ذکرِ جمیل سے بھی بہت کم خالی ہوتی تھیں، اُن کے
تاریخی مضامین میں کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر ضرور آجاتا تھا، اور جہاں ہندوستان کی قدیم اسلامی
سوسائٹی، پرانی وضعداریوں یا کسی پہلو سے پرانی تہذیب کے کسی رُخ کا ذکر ضرور آجاتا، وہاں اُن کے قلم کی
بزم آرائی، اس اُجڑی ہوئی محفل کی یاد کی تڑپ اور تاثیر دیکھنے کے لائق ہوتی ہے، اور اُن کی تحریروں میں
پرانی صحبتوں، پرانے بزرگوں کی وضعداریوں، قدیم تہذیب و آداب اور دوسری تہذیبی خصوصیات کے
بڑے دلکش مرقعے نظر آتے ہیں، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں،

فارسی زبان کے فیض کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"فارسی ادب کی حیات بخشی کا نادر ثبوت وہ فضا ہے، جو اس ادب کی فیض باری سے سرزمین
ہند میں پیدا ہوئی، اسی فضا کی روح پرور ی سے سارے مذہبی اور فرقہ واری اختلاف صلح سے بدل گئے،
ہندو مسلم، شیعہ سُنّی، سب کے سب ایک رنگ میں رنگ گئے، رنگ پوڈر کا نہیں جمعیت و یک جہتی کا
تھا، گجراتی، مرہٹی، ہندی، بنگالی، گورکھی، وغیرہ جس زبان کو لوگے، ادب فارسی کی گرمی سے اس کی
نبض میں جنبش پاؤگے، آج کل کی تصانیف نہیں، اس زمانہ کی تصنیف پڑھو، اس رنگ بلکہ بے رنگی کا
کا واضح ثبوت پاؤگے، عارف رومی کی دو بتیں یہاں برسبیل تنزل سبق آموز ہوں گی،

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد، موسی و فرعون اندر جنگ شد

چونکہ بے رنگی رسی کان داشتے موسی و فرعون دارند آشتی

حال و ماضی پر نظر ڈالو یہ شعر مکرر پڑھو، مرقع عبرت نگاہون کے سامنے آجائے گا،

افسوس دیکھتے دیکھتے اس بہار پر خزان آگئی، وہ فضا ہی مٹ گئی، خاقانی و انوری کا درس ہے مگر مٹا ہوا برائے نام بلکہ نام کو بھی نہین، کیون ادبی فضا نہین، نتیجہ آنکھون کے سامنے ہے، جو لوگ زمانہ حال کو بنا گئے، اُن کو آنکھین ڈھونڈھتی ہین، اور نہین پاتین، راجہ رام موہن رائے، پنڈت اجودھیا ناتھ سر سید احمد خان، محسن الملک اور وقار الملک آج کہان ہین، ..... اس بے کیفی کی تاریکی مین اگر کسی طرف سے روشنی نظر آجائے تو اول حیرت اُس کے بعد مسرت ہوتی ہے، (مقالات ص ۱۲۴)

تیموری دور کے ایک صاحب علم و قلم امیر راجہ کندن لال اشکی کے حالات مین لکھتے ہین،

"اس عہد کی تعلیم پر نگاہ ڈالو علاوہ علوم کے مردانہ فنون، استعمال اسلحہ، گھوڑے کی سواری، فنون لطیفہ، خوش نویسی، تصویر کشی وغیرہ دائرہ تعلیم سے باہر نہ تھے، راجہ کندن لال کی ہمہ گیر طبیعت کا رنگ اُن کی تصانیف اُن کی مختلف ملازمتون اور ان اہل کمال کی فہرست سے ٹپک رہا ہے جن سے وہ ملے، یہ ہمہ گیر طبیعتین وہی تعلیم پیدا کر سکی، جس پر صرف قدامت کے جرم مین نفرت کی نگاہین پڑتی ہین، (مقالات ص ۱۲۵)

فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاذ خواجہ عزیز لکھنوی کے حالات مین تحریر فرماتے ہین،

"لکھنؤ کی سبزی منڈی مین خواجہ صاحب کی بارہ دری گویا خیابان شیراز تھی، انسان وہان پہنچا تو حافظ و سعدی کے کمال کی مہک پاتا، رونق دوبالا ہوتی، جب علامہ شبلی بھی وہان ہوتے، اور یہ اکثر ہوتا، تو لکھنؤ کی حاضری مین خواجہ صاحب کی خدمت مین باریاب ہوتا، یہ تو یہ لازم تھا، جس وقت اطلاع پہنچتی، تو محلسرا سے اس شان سے برآمد ہوتے کہ لب پر تبسم ہوتا، ہاتھ مین چائے کا سامان بالا تر

قلبی محبت جس کا اثر تمام حرکات و سکنات مین نمایان نظر آتا، مراسم پذیرائی کے بعد بیٹھے باتین کرتے، چائے کی تیاری کا اہتمام جاری رہتا، نا ممکن تھا کہ مہمان ہاتھ بٹانے آجائے مین زعفران ضرور پڑتی، تمام کو سادی اور صبح کو دودھ ناشتہ کے ساتھ ..... خواجہ صاحب کے اوصاف مین وہ تاثیر تھی کہ سیدھی مختصر باتون پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا، بارہا حاضر ہوا، مگر کلام سننے یا حاصل کرنے مین اتنا کم کامیاب ہوا کہ گویا نہین ہوا، ہان دوسرون کا کلام سناتے ادبی نکتے بیان فرماتے، علمی سوالون کا جواب شافی ملتا، ناممکن ہے کہ ان صحبتون کا ذکر ہو، اور مرحوم کی نورانی صورت یاد نہ آئے، اس کا ایک طرف خاکساری سے بیٹھنا، کلام کے مزے لینا، نکتہ سنجی، لطف کلام ایک خاص لطف رکھتا تھا، جو برسین گذر جانے کے بعد بھی آج تک نقش ہے، (مقدمہ کلیات عزیز لکھنوی ص ۲)

خواجہ صاحب باوجاہت و عبادت گذار تھے، مذہب کی طہارت اور مشرب کی وسعت اُن کے جملہ حرکات و سکنات سے خود بخود عیان ہوتی تھی، مشک آنست کہ خود ببوید، نہایت غیور اور سیر چشم تھے، کسی کا بار احسان نہ اٹھا سکتے تھے، تحائف کا خوش اسلوبی سے فوراً عوض کر دیتے تھے، بعض دفعہ دستی بھیجنے کا موقع نہ ملا تو پارسل ڈاک مین بھیجا، باوجود وضع کی پابندی اور شان استغنا کے نہایت ملنسار اور متواضع تھا، آدمی جتنی دیر حاضر رہتا، اخلاق کی پاکیزگی سے مسحور رہتا، حسن اخلاق مذہب و فرقہ کی قید سے بالاتر تھا، مسلمان، عیسائی، ہندو سنی شیعہ سب کے ساتھ یکسان اخلاق سے پیش آتے، محض ظاہری اخلاق نہین، بلکہ وہ اخلاق جس کا دل پر اثر پڑتا، عارف جامی کا مشہور شعر گویا انکی زندگی کا اصول تھا،

بس چنان زی کہ بعد مردن تو

ہمہ گریان بوند تو خندان

اپنے استاد مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے حالات مین لکھتے ہین،

جب اس خاکدان سفلی مین اسلامی تمدن کی بہار آئی ہوئی تھی، اور اُس کے فیض سے ابتدا آخر تک

اور یورپ تینوں براعظم رشکِ گلزار بنے ہوئے تھے، اس وقت قصبات کا ایک عظیم الشان نظام ممالکِ اسلامیہ میں قائم تھا، یہ قصبات زندگی کے سرچشمے تھے، جن سے شہر خصوصاً دارالسلطنت سرسبز و شاداب رہتے، شہری آب و ہوا، دو تین نسلوں کے بعد دماغوں کو شست کر دیتی، تو قصباتی اہلِ کمال تازہ زندگی لے کر پہنچتے، اور بزمِ حیات کو از سر نو منور و معمور فرماتے، دہلی مرحوم میں شاہ صاحب اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا خاندان لاکھوں میں دو مثالیں ہیں،

ان کے عادات و خصائل کی تصویر یہ ہے:۔

"نشست و برخاست اور گفتگو میں تہذیب و وقار کی پوری شان تھی، نگاہ نیچی رہتی، کم سخن تھے، لیکن خاموشی میں بھی ایک عالم شگفتگی محسوس ہوتا، روش سادہ تھی، جفاکشی اور محنت داخلِ عادت تھی، چھتری کبھی نہ لگاتے، شدتِ گرما میں سر پر چادر ڈال کر دھوپ میں چلے جاتے، اس سلسلہ میں ایک جان پرور واقعہ سن لو،

گرمی کے سخت موسم میں ایک مرتبہ مدرسہ عالیہ کا امتحان لینے رامپور تشریف لے گئے، امتحان سے فارغ ہوتے ہوتے دوپہر کے بارہ بج گئے، حسب عادت سر پر چادر ڈال کر پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خان صدر مدرس مدرسہ جونپور کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کے لئے زنانہ مکان میں جا چکے تھے، اطلاع پر باہر تشریف لائے، اول ایک پلنگ صاف ستھرا بچھوایا، اس کے بعد مہمان محترم کی پذیرائی فرمائی،

شانِ پذیرائی غور سے سنو، یہ واقعے اب کہاں دیکھنا درکنار، سنو گے بھی نہیں، اپنے بھتیجے حافظ سعد اللہ خان کو بھیج کر کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا، مہمان گرامی کے پاؤں پر عزیز سے پانی ڈلوایا اور اپنے ہاتھ سے پاؤں دھوئے، سقاہ اللہ تعالیٰ کاساً دہاقاً،

ابھی کریم النفسی کی داستان باقی ہے، رامپور کے فاضل اجل نے راوی سے یہ واقعہ بیان فرمایا تو

یوں کہا کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے بڑا کرم فرمایا، ایسی دھوپ میں تکلیف فرمائی، وہ بھی پیادہ پا، اپنی خدمت کا اشارہ تک نہ کیا، ایک موقع پر جب راوی موصوف نے مفتی صاحب سے مولوی صاحب کی شکرگذاری کا ذکر کیا، تو فرمایا میں نے کیا کرم کیا، مجھ کو دوپہر کہیں بسر کرنی تھی، وہیں چلا گیا، کرم تو مولوی صاحب نے فرمایا یہ کہکر پاؤں دھلانے کا واقعہ بیان فرمایا، دیکھو یہ تھے وہ پاک مشرب صاف سینے جن سے علمی فیض کے چشمے کیا دریا بہتے تھے،

آمدم بر سر مطلب مزاج شگفتہ تھا، با مذاق تھا، تکلف سے بری تھے، خاص صحبتوں میں مزاح بھی فرماتے، شعر کا پورا ذوق تھا، خاص صحبتوں میں شعر کا ذکر چھڑ جاتا، تو گھڑیوں جاری رہتا، اشعار لطیف پڑھتے، لطف و خوبی ظاہر فرماتے، ایک ہی قافیہ یا مضمون پر متعدد اساتذہ کا کلام سناتے، عربی فارسی اور اردو ادب سے یکساں ذوق تھا،..... گفتگو ہر شخص سے علی قدر مراتب شفقت و محبت سے فرماتے جس کا اثر سامع محسوس کر کے محظوظ ہوتا، تعلی یا ادعا کا شائبہ بھی کلام میں نہ پایا جاتا، تقدس مآبی اور جلوہ نمائی پاس نہ تھی، تلاوت کلام مجید بھی تخلیئے میں فرماتے، سخت کلامی اور فحش الفاظ غصہ میں بھی زبان سے نہ نکلتے (استاذ العلماء ص ۳۱ تا ۳۳)"

علامہ شبلی مرحوم کی خصوصیات کا مرقع،

"علامہ شبلی مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے، اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے، ان کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا، نظر میں بلندی تھی، مزاج میں استغنا، حوصلے میں عزم تھا، مزاج میں نفاست تھی،..... صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی، انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے، کمال کی خوبیاں نظر آتیں، عقلی پیرا مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی ان کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے، جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوتی تو بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے، فضول باتیں ان کی زبان سے میں نے کبھی نہیں سنیں،.....

اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی، اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دلگیری کے ساتھ کیا، دوسرے بھائی (مولوی اسحٰق صاحب) کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی، احساس بہت شدید تھا، اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے، ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے زمانہ میں میں اور وہ ایک مکان میں مقیم تھے، ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے اُن کے پاؤں میں ڈنک مار دیا، اس قدر بے تاب ہوئے کہ مجھکو حیرت ہوگئی، اس قدر زمانہ گذرنے کے بعد آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے، یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا، ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے، نمک کھانے میں تیز ہو، دسترخوان پر نمک رکھ لیتے، اور کھانے میں ڈالتے جاتے، شیرینی بھی گلو سوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتیں کرتے جاتے ہیں، قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیرین کام ہوتے ع

سخن ہائے شیرین بہ از قند است،

مرچ کی تیزی کی تاب نہ تھی، فرماتے تھے میں نے ہمیں ہتھیار ڈالے ہیں،...... نیز پانی تیز و سرد پیتے تھے، جاڑوں میں بھی یہی ہوتا تھا، اس کے ساتھ سردی و گرمی بہت محسوس کرتے تھے، ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے، متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلی نہ ہوئی، دوسرے دن خاص اہتمام سے نہالی خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا، گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے، اس سلسلہ میں بمبئی کے سفر فارسی شعر و سخن کے یادگار رہیں گے، چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے، صبح کو نماز کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے، عادات میں سادگی تھی، لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے، غذا بہت کم تھی، آخر آخر میں غذا کی قلت پر حیرت ہوتی تھی" (مقالات ص ۱۷۰،۱۷۱)

منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کی تصویر،

"میرے محبِّ قدیم منشی احتشام علی صاحب اسی آہنی حصار قصبہ کاکوری کے چشم و چراغ اور

نامور و مستحکم آئین باپ کے فرزند تھے، اُن کی صفات میں دونوں کا جلوہ تھا، لکھنؤ کی شائستگی کا لباس میں کھانے میں، نشست و برخاست میں، معاشرت میں، گفتگو میں پورا جلوہ شائستگی کا نمایاں بلکہ تاباں تھا لباس میں وہی انداز جاڑے اور گرمی کا تھا، جو عمائد لکھنؤ کا تھا، جاڑوں میں شال اور جامہ وار کے جلوے، اُن پر نظر آتے، گرمیوں میں جامدانی وغیرہ نگاہ کو تازگی بخشتی، یہی نہیں شال جواہرات، عطر وغیرہ کی شناخت اپنے بالہ وماعلیہ کی واقفیت اور پرکھ میں اعلیٰ دماغ تھا، اب بھی خربزے اور آم کا شوق لکھنؤ کے اجڑے گھروں سے بعض نادر نمونے شال وغیرہ کے باہر آتے آتا ہے، جب ایسا موقع ہوتا، تو میں ضرور یاد آتا، قریبًا ہر سال شال کا کوئی نہ کوئی نادر نمونہ میرے واسطے خریدا جاتا، درست کرایا جاتا، اگر کنارے حاشیہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی، تو شہ خانہ سے نکلوا کر اضافہ کیا جاتا، غرض پُرانا بوسیدہ ٹکڑا نیا اور رعنا بن کر میرے سامنے آتا،

منشی صاحب کا دسترخوان قدیم مہمان نوازی، خوبی مذاق، بلند حوصلگی اور لطافت کا نمونہ ہوتا تھا برسوں دیکھا لطف اٹھایا، ایک معیار بلند تھا جس سے کبھی نیچے نہ گرا، ہر کھانا دال سے لے کر بریانی اور زعفرانی تک اپنے معیار پر ہوتا، دسترخوان ہمیشہ وسیع پایا، عزیز احباب صادر و وارد سبھی ہوتے، سب کی نشست مدارات یکساں بلا فرق ہوتی، کھانے میں منشی صاحب کی شگفتگی لطف پر وری جان نوازی فرماتی، کھانے ہر ہر موسم کی رعایت سے تیار ہوتے، عادات میں منشی صاحب تکلف تصنع طمطراق سے بالکل پاک وصاف تھے، اسی کے ساتھ نہایت شائستہ اور پختہ وضع، میں نے باون برس کی مسلسل رفاقت میں کبھی کوئی فرق کسی عادت میں نہیں پایا، بے تکلف اور مخلصانہ صاف گوئی، کلام میں نہیں رائے میں پختہ بلکہ سخت تھے، جو کسی رعب طمع، یا خاطر داری سے مرعوب و اثر پذیر نہ ہوتی،

مذہب کے سخت پابند تھے، نماز روزہ اور اوراد و وظائف پر پورے عزم سے ثابت قدم، عقائد میں مستحکم یہ اثر تھا، حضرت پیر و مرشد کے فیض کا اور منشی امتیاز علی صاحب کی تربیت کا"

نہایت فیاض تھے، عزیزون ملنے والون، صادر و وارد، حاجتمندون غربا و مساکین کی خدمت
مین علانیہ اور خفیہ برابر سرگرم رہتے، اُن کی عظیم الشان کوٹھی کا ایک حصہ گویا بورڈنگ ہاؤس تھا، جو طلبہ
کے لئے مخصوص تھا، متعدد مستقل ٹھہر کر تعلیم حاصل کرتے، بعض امتحانون کے موقع پر آتے تیاری کرتے امتحان
دیتے چلے جاتے، اور یہ سب کے سب منشی صاحب کے مہمان ہوتے،

ایک حصہ کوٹھی کا عزیزون، مہمانون، دوستون کے تصرف مین رہتا، عارضی بھی اور مستقل بھی، دوستی
اور دوست نوازی منشی صاحب کے اوصاف مین یون نمایان تھی، جیسے آفتاب کی کرنین ہر موقع پر ہر معرکہ
مین وہ دوستی کسوٹی پر پوری اترتی، محبت پیکر مجسم بن کر سامنے آجاتی، بہت کچھ لکھا گیا، پھر بھی قلب اُور
قلم دونون کہتے ہین کہ کچھ نہین لکھا، اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن پر ہو، ایک نمونہ تھے، قدیم پاکیزہ اخلاق،
وضعداری حسن مذاق شائستگی، دوستی اور اسلامی زندگی کا (مقالات ص ۳۹۹ تا ۴۰۲)"

چودھری نور اللہ خان، رئیس سہاور کی خصوصیات مین تحریر فرماتے ہین،

"جو ہتر برس کی عمر پائی، اس طویل عمر کو جس پاکیزگی اور وضعداری سے نباہ گئے، وہ ایک زندہ
زندگی ہے، ایک صدی کے ان تین چوتھائی حصون نے عالم مین کس قدر تغیرات دیکھے ہین، اور کیسے کیسے
انقلابون کا تجربہ کیا ہے، مگر چودھری صاحب کی ذات اُن کی زد سے بچی ہوئی تھی، وضع عادات و حرکات
مین اپنے نیک سلف کے طریقہ پر قائم رہے،

عادات نہایت شائستہ، مگر بیحد مستحکم اور مضبوط تھین، برآمدہ مین ایک جانب چوکی بچھی رہتی تھی اس
پر گدا اور تکیہ لگا رہتا، صبح کی نماز اور ضروریات سے فارغ ہوکر دوپہر تک اور پھر بعد ظہر اس پر نشست ہوتی
تھی، اور آنے جانے والون کاروبار کے آدمیون اور اہل حاجت کے واسطہ اذن عام ہوتا، کوئی موسم ہو
کیسی ہی سردی گرمی ہو، اس مین فرق نہ آتا تھا، عصر کی نماز کے بعد ہواخوری کے واسطے جنگل کو تشریف
لیجاتے اور مغرب کے وقت واپس آتے تھے، آندھی آئے بارش ہو اس مین تغیر نہ ہوتا تھا، (مقالات ص ۱۵۰)"

ذوق ادب و انشاء، فطرۃً لطیف الطبع نفیس مزاج اور نازک خیال تھے، خوشگوار رنگینی کی بھی ہلکی سی جھلک
تھی، اُن کی لطافتِ ذوق کا اثر اُن کی پوری زندگی مین نمایان تھا، چنانچہ اردو اور فارسی دونون زبانون
کے شعر و ادب کا بڑا ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، اردو کے صاحبِ طرز ادیب تھے، اور اپنی تحریرون مین
حسن انشاء کا خاص اہتمام رکھتے تھے، اس لئے گو اُن کی تحریرین متین اور باوقار ہوتی تھی لیکن اس مین ادب
و انشاء کی تمام خوبیان اور لطافتین موجود ہوتی ہین، اپنے مجموعۂ مقالات کے دیباچہ مین لکھتے ہین:-

"ایام طالب علمی مین کتاب مختصر المعانی علامہ تفتازانی کی پڑھی تھی، اس مین علامہ کا یہ قول
بلاغت مین پڑھا تھا، کمال بلاغت اس مین ہے، کہ واقعات کے بیان مین جوہر بلاغت نمایان ہون،
اس لئے کہ واقعہ نگاری مین بیان واقعات کے تابع ہے، لہذا میدان تنگ ہے، اور افسانہ و خیالی
مضامین کی نگارش مین بیان آزاد ہے، اور افسانہ و مضامین تابع اس قول کو دل نے لے لیا، لکھنے
کا شوق واقعہ نگاری مین پورا ہوا، افسانہ اور خیالی مضامین سے طبیعت کنارہ کش رہی، خود ستائی مذموم
ہے تاہم بعض نکتہ سنج اربابِ ذوق نے جو خیال میری تحریرون کی بابت ظاہر فرمایا ہے، اس سے معلوم
ہوتا ہے، کہ مین بحمد اللہ کامیاب ہوا، اب نظر کو بڑھایئے، مقالات پڑھئے، اور خود فیصلہ کیجئے"

بلاغت کے ان نکتون سے اُن کی کوئی تحریر خالی نہین ہے، خصوصاً شعر و ادب کے مضامین مین جوہر
بلاغت زیادہ نمایان ہین، امیر خسرو کی مثنوی مجنون و لیلیٰ کا مبسوط مقدمہ جو مرحوم کی تنقید و تصحیح کے ساتھ
ساتھ شائع ہوئی ہے، اور خود مرحوم کے دیوانِ فارسی مین اُن کے قلم سے فارسی شاعری کے ادوار اور اسکی
خصوصیات پر تبصرہ اُن کی ذوق ادب نکتہ سنجی اور حسن مذاق کے اچھے نمونے ہین لیکن یہ سب بہت طویل ہین
اُن کے اقتباسات نقل کرنا دشوار ہے، اس لئے ان کی مختلف تحریرون سے ادب پارون کے کچھ نمونے نقل
کئے جاتے ہین،

مرحوم نے اپنے زمانۂ شباب مین حیدرآباد کے رسالہ حسن مین بابر پر ایک مضمون لکھا تھا، جو ۲۰ سال

کے بعد جب کہ اس بہار پر خزاں آچکی تھی، کتابی صورت میں شائع ہوا، اُس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"جون ۱۹۰۸ء سے ستمبر سنہ مذکور تک مضمون بالا رسالہ حسن میں شائع ہوتا رہا۔ اس کو ۴۲ برس گذر گئے، وہ وقت ابتدائے شباب کا تھا، زندگی تازہ بہار تھی، امیدوں کے پھول سے دل و دماغ شگفتہ و شاداب تھے، زندگی بعینہٖ اسی دلآویزی کے ساتھ نظر کے سامنے تھی، جیسے کسی خوشنما شہر کا پہلا منظر، اب بھی مضمون کے مطالب میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، البتہ تقاضائے عمر نے فطرۃً بعض الفاظ کی شوخی و رنگینی پر چشمک زنی کی، مگر تصرف سے یہ خیال مانع رہا کہ یہ شوخی و رنگینی زندگی کے دورِ عزیز کی امانت ہے، اور امانت میں دست اندازی ناروا، وہ عزیز عہد نہ رہا، تو اس کی یادگار رہے، یاد رہے ع

جوانی کجائی کہ یادت بخیر، "

فارسی غزل کی خصوصیات کے جلوے ملاحظہ ہوں،

فارسی غزل کو دیکھو، مضامین اس میں بھی تقریباً متحد ہیں لیکن یہاں (اردو غزل) سے وہاں (فارسی غزل) ایک بات زائد ہے، یعنی خیال، اس خیال کی نیرنگی نے غزل کو ایک ایسا شاہد رعنا بنا دیا ہے جس کے جلوؤں کی انتہا نہیں، جب دیکھو ایک نیا جلوہ دیدہ افروز ہوگا، اور پہلا جلوہ دوسرے سے اتنا ممتاز ہوگا کہ یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ یہ وہی آفتِ روزگار ہے، جو پہلے جلوہ گر تھا، یاد رہے،

عربی فارسی میں جس چیز نے شور محشر بپا کر رکھا تھا، وہ تصوف ہے، فارسی عربی گویوں میں بہت سے باکمال ایسے ہوئے جن کے سینوں میں عشقِ حقیقی کی آگ شعلہ زن تھی، یہ شعلے جب منہ سے نکلے تو غزل کہلائے" (مقالات ص ۷۰، ۶۸، ۶)

شوکت بلگرامی نے رباعیات خیام کا ترجمہ اردو رباعی میں کیا تھا، اس کا دیباچہ مولانا شروانی نے لکھا تھا، اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"رباعیوں کا وزن مخصوص ہے، زبان مخصوص، خیال پورا ہو نادر ہو، توحید، حکمت یا عشق کا نچوڑ اس میں ہو، ان قیود کے ساتھ چاروں مصرعے باہم ایسے مربوط ہوں کہ ایک پھول کی چار پنکھڑیاں معلوم ہوں، قلم شکن یہ کہ چوتھا مصرعہ کڑی کمان کا تیر بن کر نکلے، جو دل پر جا بیٹھے، خلاصہ یہ کہ ہر صنف سخن کی جان رباعی میں کھپانی پڑتی ہے، غزل کی تڑپ قصیدے کی متانت مثنوی کا تسلسل رباعی میں ہو، اس کے ساتھ رباعی کا مخصوص اختصار میدانِ سخن کو تنگ کر کے اشہبِ قلم کی کمر توڑ دیتا ہے، حاصل کلام عطرِ سخن رباعی ہے،

نیشاپور کے میخانہ قدیم میں ایک پیر میکدہ خیام تھا جس کے جام میں حکمت کا امتزاج ہوا، اس امتزاج سے نشہ دو بالا ہو کر جو رنگ لایا، اس کی جھلک اس بادۂ شیراز میں ہے،

از آن افیون کہ ساقی در مے افگند حریفان را نہ سر ماند نہ دستار

ممالکِ ایشیا اس نشہ سے جھوم رہے تھے، یورپ بھی جامِ اول میں بیخود ہو گیا، افلاطون کدۂ بلگرام کے خم نشین شوکت نے اس بادۂ کہن کو تازہ روانی بخشی اور دورِ جدید سے آشنا کیا، یعنی نیشاپوری شراب اردو کے ساغر میں لنڈھالی، اس مے دو آتشہ سے نشہ کی رسائی دو بالا ہو گئی، اسی مے دو آتشہ پر اس وقت ایک نظر ڈالنی ہے، مبادا دامنِ صدارت پر دھبہ لگے، (ریاست حیدرآباد کی امور مذہبی کی صدارت کی طرف اشارہ ہے) اس لئے اول ایک شعر سنا دیتا ہوں:۔

نہ من تنہا درین میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار شد مست"

(دیباچہ مے دو آتشہ)

شیخ محمد بن طالب گجراتی کے حالات کی تمہید میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لبِ بام پہنچا تھا کہ ایک اور آفتاب علم طلوع ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب ملک عرب کو گئے، اور چشمۂ رحمت کا صاف اور خالص آبِ حیات دل سے لگا کر لائے، شاہ صاحب کا فیض تھا کہ دریا بن کر ملک میں پھیلا اور سرد دلوں کی خشک کشت زار سرسبز ہو کر لہلانے لگی، (مقالات ص ۲۹۰")

خواجہ میر اثر دہلوی کا سلسلہ شاعری یہ ہے، خواجہ میر درد محمد ناصر عندلیب، شاہ سعد اللہ گلشن، شاہ محمد قدرت اللہ تجلّی، یہ اصحاب شاعری کے ساتھ صاحب دل بھی تھے، مولانا شروانی خواجہ میر درد کے دیوان کے دیباچہ میں یہ شجرہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

"دیکھو تجلّی کی جلوہ نمائی سے گلشن ہوا، گلشن نے نامۂ عندلیب پیدا کیا، نالۂ عندلیب سے درد جلوہ افروز ہوا اور درد سے اثر پیدا ہوا،

این سلسلہ از طلائے ناب است ‏ ‏ ‏ ‏ این خانہ تمام آفتاب است"

الندوہ کی اڈیٹری میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ مولانا شروانی کا نام بھی تھا، اس کی مصلحت یہ بیان کی ہے :-

"جب اس رسالہ کے اجراء کی تجویز مجلس انتظامیہ نے منظور کی تھی تو اڈیٹری میں میرا نام اس وجہ سے ضم کیا گیا تھا کہ میری جہالت کی تاریکی علامہ شبلی کے خیالات کی تیز روشنی کی چکاچوند کو کم کرتی رہے گی، اور بدگمانی کا زیادہ موقع نہ ملے گا۔ (مقالات ص ۲۰۱)"

علی گڈھ کالج کے مشہور استاد پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کی ملاقات اور تعلقات کے علمی فوائد کی ان الفاظ میں تعبیر کی ہے،

"یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے، اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا سبب بنتی ہیں"

مولانا شبلی کو شیرنی بہت مرغوب تھی، کچھ نہیں تو شکر کے دانوں ہی سے شغل کیا کرتے تھے، اس کا اس پیرایہ میں اظہار کیا ہے،

"شیرنی حلوسوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتیں کرتے جاتے ہیں، قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام شیریں کام رہتے ع

ع سخنہائے شیریں بہ از قند ہست"

خواجہ عزیز لکھنوی بہت کم سخن اور خاموش تھے، ان میں شیریں بیانی نہیں تھی، دیکھئے یہ عیب حسن بیان سے ہنر بن جاتا ہے،

"کم سخن تھے، اور سادہ بیان خود ستائی سے کوسوں دور اسلئے گفتگو میں خوش بیانی نہ تھی، مگر ع

ورائے شاعری چیزے دگر ہست

لیکن خواجہ صاحب کے اوصاف میں وہ تاثیر تھی کہ سیدھی سادہ مختصر باتوں پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا"،

ایسے ادبی شرارے جن سے پوری تحریر چمک جاتی تھی، اُن کی تحریروں میں بکثرت ملتے ہیں بلکہ ان کی کوئی تحریر بھی اُن سے خالی نہیں جس کا اندازہ اوپر کے طویل اقتباسات سے بھی ہوا ہوگا، یہ نمونے مثالیں اندازہ کرنے کے لئے پوری طرح کافی ہیں، درحقیقت دوسرے صاحبزادیوں کی طرح مرحوم کا بھی ایک نہایت دلکش اور دلپذیر طرز تھا، جو انہی پر ختم ہوگیا،

صدر یار جنگ

ذاتی تاثرات

از جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

نام نامی پر نظر سب سے پہلے اس وقت پڑی جب اپنا زمانہ اسکولی طالبعلمی کا تھا، اور مولانا شروانی ایک خاصہ پختہ کار اہل قلم، اپنی جوانی کی آخری منزلون مین تھے، اور علی گڈھ منتھلی کے مضمون نگار تھے، یہ ذکر کوئی ۱۹۰۵ء کا ہے، چندہی روز مین دیکھا کہ اسم گرامی الندوہ (لکھنو) کے سر ورق پر شریک ادارت کی حیثیت سے ہر مہینہ چھپ رہا ہے ___ ایک اڈیٹر تو مولانا شبلی نعمانی تھے، اور دوسرے ان کے حبیب لبیب اور ہم قافیہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی،

الندوہ مین شروانی صاحب نے لکھا لکھایا تو برائے نام ہی لیکن نام بحیثیت اڈیٹر کے برسون چھپتا رہا ___ کچھ ہم رنگی اس باب مین مولانا شرر مرحوم سے حاصل رہی، تخلص ان کا بچہ بچہ کی زبان پر، لیکن شاعری کا نمونہ دیکھنا چاہیے تو کسی "ریسرچ اسکالر" کی دستگیری کے بغیر کامیابی ممکن نہین! مضمون شاید چند سال کی مدتِ ادارت مین ایک ہی لکھا، "حیات خضر" دو نمبرون مین، باقی ان کے نام کا تلازم مولانا شبلی کے نام کے ساتھ ذہن مین خوب جم گیا! ___ دو چار سال اور گذرے، اور اب کالج کی طالب علمی کے زمانہ مین جب تقریباً روزانہ حاضری مولانا شبلی کی خدمت مین رہنے لگی، تو معلوم ہوا کہ کم از کم جہانتک معاملاتِ ندوہ کا تعلق ہے، خان شروانی اور شیخ نعمانی کے درمیان چولی دامن کا ساتعلق ہے،

ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم! ___ علی گڈھ اور اعظم گڈھ کے درمیان ایک اور وجہ ارتباط، ایک اور رشتہ توافق و اتحاد!

صوری زیارت سب سے پہلے ندوہ کے ایک جلسۂ انتظامیہ مین ہوئی، سنہ غالباً ۱۹۱۱ء تھا، ارکان مین دو پارٹیان تھین (اور مسلمانون کی کس انجمن یا ادارہ مین پارٹیان نہین!) ایک فریق کے لیڈر مولانا شبلی تھے، اور دوسرے کے قاری شاہ سلیمان پھلواروی اور مولوی خلیل الرحمٰن سہارنپوری، ہم لوگ کالج کے چند لڑکے بھی تماشائیون مین شریک کہ اگر کسی موقعہ پر پبلک کی مدد کی ضرورت پڑی تو پبلک کے نمایندہ بنکر مولانا شبلی کو کمک پہنچائی جائے گی، فلان صاحب آئے اور فلان صاحب آئے ___ اپنے لیے فخر کا یہ موقع کیا کم تھا کہ ایسے معزز جلسہ مین بیٹھنے کو مل گیا، تماشائی ہی کی حیثیت سے سہی! ___ یہانتک کہ مولانا شروانی آگئے: حسن مردانہ کا نمونہ، چہرہ پر شرافت برستی ہوئی، متانت بلائین لیتی ہوئی، مشہور یہ تھا کہ یہ زبردست "شبلوی" ہین، دیکھنے مین یہ آیا کہ یہ اپنا دامن ہر فریقانہ آلودگی سے بچائے ہوئے، نہ گفتگو مین گرمی، نہ لہجہ مین درشتی، ایک پیکر حلم و آشتی،

سنہ غالباً ۱۹۱۵ء تھا کہ اپنی ایک لغوسی کتاب (لغو، تو اب کہہ رہا ہون، اس وقت تو وجہ نازش تھی) فلسفہ اجتماع کا مقدمہ الناظر مین نکلا، اس مین دہلی کے ایک واقعہ سے متعلق مولانا شبلی پر تعریض تھی، اس کی تردید اور صفائی مین بطور شاہد عینی کے شروانی صاحب کا مضمون الناظر کے دوسرے ہی نمبر مین موجود، لیکن تردید مین دلخی نہ تعریض، بس صاف اور سادہ بیان واقعہ، سیرت کی شرافت کا اثر چہرہ ہی پر نمایان نہ تھا، قلم بھی اسی رنگ مین ڈوبا ہوا تھا،

۱۹۱۸ء کی شاید جولائی کا مہینہ تھا کہ شروانی صاحب حیدر آباد صدر الصدور امور مذہبی ہو کر پہنچے، ان کی مذہبیت اور گہری دینداری کا ڈنکا بجا ہوا، مین اپنی زندگی کے اسی دور مین الحاد و بے دینی کے لیے بجا طور پر رسوا اور بدنام، اور عین اسی زمانہ مین، ایک کتاب کے سلسلہ مین خاص طور پر حیدر آباد

کے سلم پریس کی زد میں آیا ہوا، شروانی صاحب عہدہ کے لحاظ سے بھی مجھ سے کہیں اونچے مرتبہ پر، پہلی مرتبہ حاضری
کی نوبت اتنے مخالف حالات میں آگیا تو بہت ڈرتے ڈرتے، لیکن پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہو گیا کہ ڈر بے محل
اور اندیشہ بیجا تھا، خوب ملے، اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا کہ میری بد مذہبی اور بد عقیدگی ان کی شفقتوں اور
عنایتوں کی راہ میں کچھ بھی حائل ہو رہی ہے، —— اپنا رہنا اس کے بعد کچھ ہی دن اور حیدر آباد میں ہوا،
شروانی صاحب کی فرض شناسی، دیانت، بے لوثی، مستعدی اور کارگذاری کے چرچے سن سن کر جی
خوش ہوتا رہا،

اگست میں رخصت پر لکھنؤ آیا، اور یہاں سے استعفا لکھ کر بھیجا، بیکاری کو ابھی ۸ ہی ۹ مہینے ہوئے
تھے کہ اپریل یا مئی میں سر امین جنگ مرحوم (صدر المہام پیشگاہ مبارک) کا تار پہنچا کہ اعلیٰ حضرت نے یاد
فرمایا ہے، فوراً آجاؤ، گیا، اسٹیشن پر ہی حکم ملا کہ قیام سرکاری طور پر صدر الصدور امور مذہبی کے یہاں رہیگا،
جانا اور رہنا پڑا، ۴، ۵ روز کے قیام میں مولانا کو خوب قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ ان کی صحیح مذہبیت
(جس میں تعصب و نفرت کا شائبہ نہ تھا)، دینی پختگی (جو کہ خشکی سے نا آشنا تھی) معتدل اور متوازن خوش اخلاقی،
مہمان نوازی، ایک مرتب نظام اوقات کی پابندی، جدید اور قدیم رنگ کی خوشگوار آمیزش، لباس و
طرز معاشرت کی نفاست، وضعداری، ایک ایک چیز کا شاہدہ ہو گیا، اور ایک ایک چیز دل میں اتر گئی،
اعلیٰحضرت کے یہاں باریابی، اور پھر میرے لئے ماہوار تصنیفی وظیفہ کی منظوری کے سارے مرحلوں میں مرحوم
جس شفقت اور اخلاص کے ساتھ قدم قدم پر رہنمائی فرماتے رہے، اس کا نقش آج تک دل پر تازہ ہے،
اب تعلقات بڑھے، اور مراسلت خاصی کثرت سے رہنے لگی، اور ذاتی، قومی، ملی، دینی سب ہی مسئلے
موضوع گفتگو ہے، اور ملاقاتیں کبھی لکھنؤ میں ہوتی رہیں، کبھی علی گڈھ میں، اور کبھی حیدرآباد ہی میں، ——
مرحوم کو ندوہ کے ساتھ شغف تھا، اس کے رکن کیا معنی رکن اعلیٰ تھے، پابندی کے ساتھ اس کے ہر جلسہ میں
شریک ہوتے، علی گڈھ سے سفر کر کے لکھنؤ آتے، اور ہمیشہ اپنے محب خصوصی منشی احتشام علی علوی کاکوروی مرحوم

کے ہاں ان کی خیابی گنج والی کوٹھی میں ٹھہرتے جب تک سفر کی قوت ذرا بھی باقی رہی، اس معمول میں نہ فرق
آنے پایا، اور علی گڈھ تو گویا ان کا گھر ہی تھا، یونیورسٹی کورٹ کی ہر میٹنگ میں التزام کے ساتھ کیوں نہ آتے،
مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر، خواہ طوعاً خواہ کرہاً، ہر تھوڑی مدت کے بعد بدلتے رہے ہیں،
ابھی مہاراجہ محمود آباد اس عہدہ پر ہیں، تو ابھی صاحبزادہ آفتاب احمد خان، کل سر سلیمان کا تخت سلیمانی اتر
رہا ہے تو آج سر راس مسعود کے ورود مسعود کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ابھی نواب مزمل اللہ خان کا طوطی بول
رہا ہے، تو ابھی سر ضیاء الدین کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے، ابھی نواب محمد اسمٰعیل خان ہاتوں ہاتھ لائے
جا رہے ہیں، تو ابھی ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی پیشوائی کے لیے فرش بچھ رہے ہیں، کورٹ کے ممبر کچھ ان کے
ساتھ کچھ ان کے ساتھ، اور کچھ "ان" اور "اُن" دونوں سے الگ صرف اپنے ساتھ —— شروانی صاحب
کا مرکز ثقل ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم، ندوہ میں بھی تو اپنا امتیاز اسی طرح قائم رکھے ہوئے تھے، مولانا شبلی
اور منشی احتشام علی کی پارٹیاں آپس میں برسرپیکار، لیکن شروانی صاحب کے تعلقات دونوں سے یکساں ہموار
و خوشگوار، گویا دونوں کے درمیان ایک نقطۂ اتصال!

سنہ ۱۹۲۰ء و ۲۱ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص ہیجان کا دور ہوا ہے، تحریک خلافت
و ترک موالات کا طوفان زوروں پر، ملک کا سواد اعظم شیخ الہند مولانا عبد الباری فرنگی محلی، اور علی برادران
اور مولانا ابو الکلام کے ساتھ، ساری فضا پہ یہی حضرات چھائے ہوئے، ندوہ اور علی گڈھ دونوں زد پہ
اور ندوہ غریب تو خیر، اصلی اور معرکہ کا مورچہ علی گڈھ تھا، شروانی صاحب مع اپنے گنے چنے افراد کے
دوسرے کیمپ میں، کچھ نہ پوچھیے کہ کیا کچھ سننا پڑا، کیا کچھ سہنا پڑا، جوش اور ہیجان کے وقت کس کو اپنی
زبان و قلم پر قابو رہا ہے، آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے، اور کل "حبیب الرحمن" سے "حبیب الشیطان"
مشہور ہوئے! —— یہ بندۂ خدا سب کچھ صبر و متانت ہی سے سنتا رہا، سہتا رہا،

ایک زمانہ وہ تھا، ۱۳، ۱۴ سال قبل جب ابو الکلام آزاد کا شمار حلقۂ شبلی میں مبتدیوں میں تھا،

اور مولانا شروانی کے ہان ان کا تقرب خود ان کے لیے باعث فخر و مباہات تھا، اب دیکھتے دیکھتے وقت وہ آگیا تھا کہ مولانا ابو الکلام لیڈری کے بام بلند پر تھے، اور شروانی صاحب ایک اہل قلم اور چھوٹے موٹے رئیس کی حیثیت سے جہان تھے وہین قائم ——— ظرف و شرافت کے امتحان کا اصلی وقت، دوستی و اتحاد کا نہین، مخالفت و بیزاری ہی کا وقت ہوتا ہے، پٹھان تو اپنی تند مزاجی کے لیے بدنام ہین، اور شروانی پٹھانون ہی کے ایک خاندان کا نام ہے، صدریار جنگ کی مثال نے دکھایا کہ جنھون نے پٹھانون کو حلم و متانت سے یکسر معریٰ قرار دیا ہے، انھون نے کلیہ قائم کرنے مین جلدی یا غلطی کی ہے! محمد علی جوہر کا ایک شعر خفیف تصرف کے ساتھ ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کہو ایک سا خیال
پاتے ہین حلم[1] بھی کبھی شروانیون مین ہم

مارچ سنہ ۱۹۲۲ء تھا کہ اس وقت کی خوش عقیدگی کے جوش مین ارادہ عرس اجمیر مین شرکت کا کر لیا، لکھنؤ سے ساتھ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے قافلہ کا ہو گیا، ان پر باوجود علم و فضل کے مشائخانہ رنگ غالب تھا، خیر صاحب اجمیر پہنچکر مولانا کی پارٹی کی خوب خاطرداریان ہوئین، شروانی صاحب بھی یہان آئے ہوئے تھے، ذاتی طور پر ہر آستانۂ چشت کے عقیدتمند تو تھے ہی، لیکن یہان اس وقت انکی آمد سرکاری حیثیت سے تھی، مملکت حیدرآباد کے صدر الصدور محکمۂ امور مذہبی کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، اعزاز و تکریم کے ساتھ ہر طرف سے ہاتھون ہاتھ لیے جا رہے تھے، اور دیوان صاحب درگاہ کے مہمان خاص تھے، رات کے وقت محفل سماع مین دیکھا، عام لوگون کی صف مین مسند سے دور ایک معمولی شریک محفل کی طرح بیٹھے ہوئے! ان سے کہین بہتر جگہ پر تو ہم لوگ قابض تھے، وہ ذرا چاہتے تو بہتر سے بہتر جگہ ان کے لیے خالی کرائی جا سکتی تھی، لیکن طبیعت مین یہ انکسار کہ ہر طرح قدرت رکھنے کے

(طاق)

[1] اصل شعر مین بجائے حلم کے عقل ہے

باوجود اپنے لیے مقام امتیاز کسی طرح گوارا نہین! ——— غلبۂ تواضع کے مشاہدہ کا یہی ایک موقع نہ تھا، حیدرآباد، اعظم گڈھ، علی گڈھ، لکھنؤ مین خدا معلوم کتنی بار اور مشاہدے اسی قسم کے پہلے بھی ہو چکے تھے، اور بعد کو بھی ہوتے رہے، سنہ ۱۹۴۲ء یا سنہ ۴۳ء مین علی گڈھ مین کسی عالم دین کا تقرر ہونے والا تھا، انتخابی کمیٹی مین مولانا شروانی کے ساتھ یہ خاکسار بھی تھا، انٹرویو کے وقت جب مختلف علما آنے شروع ہوئے، تو صدر مجلس (وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد) کرسی صدارت پر صدریار جنگ کو بٹھا کسی ضرورت سے باہر چلے گئے، ان حضرت نے کیا کیا کہ معاً خود بھی کرسی صدارت چھوڑ اپنی جگہ اس بے علم و عمل کو بٹھا دیا! مین شرمندگی سے گڑا جاتا تھا لیکن ان کے شدید اصرار کے سامنے میرا انکار کیا کچھ چل پایا! ——— اور آخر زمانہ مین جب تک ذرا بھی سفر کے قابل رہے، یہ تو بارہا دیکھنے مین آیا کہ لکھنؤ مین ندوہ کی مجلس انتظامی کا جلسہ ہو رہا ہے، اور حضرت صدریار جنگ اپنی مستقل صدارت چھوڑے ہوئے اپنے ایک نیازمند ہی کی عزت افزائی کر رہے ہین!

گفتگو بڑی پر لطف ہوتی تھی اور پر مغز بھی، علمی، ادبی، شعری، مذہبی، تعلیمی، سیاسی جو موضوع بھی چاہیے چھیڑ دیجیے، اور گھنٹون اس مجلس سے سیری نہ ہوگی، اللہ نے رئیس کے ساتھ ساتھ دل کا رئیس بھی بنایا تھا، کھاتے پہنتے تو خوب تھے ہی، کھلانے کا ذوق بھی خوب رکھتے تھے، اور جاڑون کے موسم مین شب دیگ کی دعوت بڑے اہتمام سے کرتے، اس دعوت مین جو ایک بار بھی شریک ہو جاتا اس کا مزہ مدتون نہ بھولتا ——— تحریر مین ادب سے بڑھکر انشا پرواز کی شان رکھتے تھے، متین، سلجھا ہوا انداز بیان اور ہر طرح گٹھا ہوا، الفاظ ضرورت سے زائد نہ کم، بس ٹھیک اتنے ہی جتنے مؤثر اداے مطلب کے لیے ضروری ہوتے. گویا ہوشیار اور فنکار معمار عمارت مین کڑھی ہوئی اینٹین چن چن کر اور گن گن کر لگا رہا ہے! ——— اور تحریر سے بڑھ کر اس کمال فن کا ظہور تقریر و گفتگو دونون مین، میدان مین خطاب عام ہو تو اور کمرہ کے اندر خطاب خاص ہو تو، زبان حشو و زوائد سے ناآشنا، میٹھے میٹھے بول گنے چنے ہوئے، دلکشی و تاثیر کے سانچے مین ڈھلے ہوئے، سنہ ۱۹۲۶ء مین جب حج و زیارت سے واپس آئے ہین تو حالات سفر خصوصاً مشاہدات

مدینہ منورہ سادہ اور بے ساختہ زبان مین اس انداز سے بیان کرتے کہ سمان بندھ جاتا، خود بھی آبدیدہ ہو جاتے اور سننے والون کو بھی رلا دیتے،

غیرت دینی اور حرارت ایمانی کے تو کہنا چاہیے کہ پتلے ہی تھے، ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء مین اردو کے ایک مشہور رسالہ نے دینی و اعتقادی حیثیت سے بڑا سر اٹھا رکھا تھا، ضرورت اس کی تھی کہ ملت اپنی اجتماعی قوت سے فتنہ کی سرکوبی کرے، خیر وہ جون تون کرکے ہو گیا، شروع ۱۹۳۲ء مین ایک منزل ایسی آئی کہ قانونی کارروائی کے لیے حکومت وقت کی منظوری لینی ضروری تھی، صوبہ گورنمنٹ کے ہوم ممبر نواب مزمل اللہ خان مرحوم تھے، ان پر مجرم کی طرف سے سفارشون کا جادو چل چکا تھا، ان اثرات کو باطل کرنے کے لیے درکار ایسی ہی زبردست شخصیت تھی اور وہ صدر یار جنگ کی ذات مین ہاتھ آ گئی —— بیچارو نے پس پردہ رہ کر وہ سب کچھ کر دیا جو ایک مرد مومن کو ان حالات مین کرنا تھا،

اے چند سال گذرے تھے کہ ایک اور فتنہ کا سامنا کرنا پڑا، آج سے ۲۵ سال قبل ہمارے جوار مین ایک نوجوان وکیل سجاد علی انصاری مرحوم تھے، پڑھنے لکھنے کے بڑے شائق، بڑے ذہین و شوخ نگار، ذاتی طور پر خدا کے فضل سے پورے مذہبی، لیکن مذہبی عنوانات پر قلم اٹھاتے تو معلومات کی سطحیت و بے مغزی کے ساتھ شوخیون مین بھی حدود سے تجاوز کر جاتے، علی گڈھ میگزین وغیرہ مین طالبعلمی کے زمانہ مین مضمون لکھا کرتے، اور ہم لوگ بھی داد دے دیتے، جس طرح ہر نومشق اور ہونہار اہل قلم کی ہمت افزائی کے خیال سے داد دی جاتی ہے، اللہ کا کرنا کہ ۱۹۲۷ء مین تو سجاد مرحوم کا عین شباب مین انتقال ہو گیا، اور اس کے کئی سال بعد بعض "خوش مذاق" بے فکرون نے ان کے مضامین اور ایک ناتمام ڈراما کو کتابی صورت مین چھاپ دیا، اور علی گڈھ کے شعبہ اردو کے کارکنون کو خدا معلوم اس مین کونسی ادبی خوبیان نظر آئین کہ کتاب کو داخل نصاب کر دیا، اس خاکسار کو جب اس کا علم ہوا تو اس کھلی ہوئی بدمذاقی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا، اور پہلے بادب تمام یونیورسٹی کے استادون

کی خدمت مین عرض معروض کیا، مطلق پذیرائی نہ ہوئی، ہار کر اور مجبور ہو کر بلند آواز سے چیخنا چلانا پڑا، اور اب یہان سے شرکت صدر یار جنگ کی شروع ہوتی ہے، وسط ۱۹۴۳ء مین ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی، جس کے صدر نواب موصوف تھے، اس مجلس نے متفقہ طور پر کتاب کو نصاب سے نکلوایا، حضرت کی پوری رائے صدق ۸ر نومبر ۱۹۴۳ء مین اس کے ڈھائی تین کالمون مین درج ہو چکی ہے، یہان اس کے چند اقتباسات کافی ہون گے :-

"علی گڈھ میگزین کی جو بھی عزت کی جائے، بہر حال اردو کے اعلیٰ میگزین مین نہ تھا، اس مین مضامین کی اشاعت کسی بلندیٔ خیال یا پاکیزگیٔ ادب کی ضامن نہین ہو سکتی،

سخت قابل افسوس اور خطرناک یہ پہلو ہے کہ سجاد فلسفہ، اخلاق و مذہب سب ہی سے بیزار ہین، مذہبی ادب کی عظمت کا ایک فقرہ مین بخیال خود خاتمہ کر دیا ہے، گویا ان کے یہان کوئی اصول زندگی نہین اپنے اصول زندگی محبوب و مقبول ہے، ان کے ہان تین محبوب ہین، عورت کا شباب بشرطیکہ وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک صاف ہو، ایک غرق شباب قحبہ جو کسی کو پر داد عیش دے رہی ہو، وفا اور پابندی سے سخت بیزار ہو، کمالات نسوانی کا بہترین نمونہ ہے، اس کی تعریف مین ان کے تمام مضامین رطب اللسان اور گلریز ہین، اگر کوئی نوجوان عورت نکاح کرکے عصمت و عفت کی زندگی بسر کرے تو وہ خارج از بحث، ننگ انسانیت ہے،

دوسرا محبوب "معصیت لطیف" ہے، اگر باوجود پوری کاوش کے مجھکو پتہ نہ لگا کہ ان دو لفظون کا اصلی مفہوم مضمون نگار کے ہان کیا ہے، پڑھنے والا جس گناہ سے لطف لینا چاہے اسکو محبوب قرار دے لے،

تیسرا محبوب ان کا شیطان اور شیطنیت ہے، اول سے آخر تک شیطان اور شیطنیت کو سراہا ہے، خلاصۂ کائنات قرار دیا ہے، بلکہ پیدایش عالم کی اصل حکمت،

اس کے مقابلہ مین انبیاء کرام، ملائکہ مقربین بلکہ ان کے "ڈراما" "جزا" کا خدا بھی پست و بے وقعت

ہیں، حضرت جبرئیل اور دوسرے مقرب فرشتوں کی جس طرح اس ڈراما میں شیطان کے مقابلہ میں تضحیک کی گئی ہے، اس کو پڑھکر ڈرامانگار کی فہم و دانش پر سخت تاسف ہوتا ہے، مذہب کے استخفاف سے محشر خیال اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے، مضامین زلیخا، روز جزا میں جس طرح مضامین قرآنی کے مقابلہ میں کم فہمی، جسارت اور خیرہ چشمی کا ارتکاب ہے، وہ قابل صد نفرین ہے .... بہر حال میری رائے میں محشر خیال نہ ادب ہے، نہ لٹریچر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور تخییل ارنضب العین کی، اس طرح یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ درس میں رہنے کا اپنی کسی خوبی کے لحاظ سے حق نہیں رکھتی ہے، اس کے اوصاف خود اس کے قدردانوں نے دو تین لفظوں میں بیان فرما دیے ہیں، "شعلہ مستعجلہ" "تملایا اور جگمگایا" بس یہی پوری تعریف محشر خیال کی ہے، رات کو جگنو جگمگایا، تلملایا، تھوڑی دیر میں شعلہ مستعجلہ کے مانند گل اور خاموش، پھر تاریکی اور اندھیرا۔"

اقتباس کے ذرا لمبے ٹکڑے سے مرحوم کی ادبیت، ذوق نظر، مذہبیت سب پر خاصی روشنی پڑ گئی، مسلم یونیورسٹی کی دینیت کے حق میں وہ ایک ستون مستحکم تھے، اور ملت کے سامنے ان کی تحریریں ادب دین اور ادب صالح کا ایک کامل ترین نمونہ تھیں، اب ایسی جامع شخصیت ڈھونڈھنے سے بھی کہاں نظر آئے گی؟ ــــ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ سکینہ ٹون بار کی طرح ایک بار پھر پڑھکر دل تھام لیجئے،

تاریخ اخلاق اسلام

اس میں اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتوں سے نقد و تبصرہ ہے،

(مصنفہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت: ۱۲ع

"منیجر"

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے خاندانی اور ذاتی حالات

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے

علی گڈھ کا شروانی خاندان صوبہ متحدہ کا نہایت ممتاز صاحب وجاہت اور تاریخی خاندان ہے، مسلمانوں کی تعلیم جدید کا مرکز بھی علی گڈھ ہی تھا، اس لیے شروع سے اس کی امداد و اعانت میں شروانی خاندان کا بڑا حصہ رہا، نواب سر مزمل اللہ خان مرحوم شروانی عرصہ تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، اور اس کو لاکھوں روپئے کے عطیے دیے، خود مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مسلم یونیورسٹی کے رکن رکین اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، ان کے علمی و تعلیمی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس لیے دنیاوی دولت و وجاہت کے علاوہ اس خاندان نے علمی و تعلیمی خدمات انجام دی ہیں، اس لیے مولانا شروانی کی یادگار کے سلسلہ میں اس خاندان کی مختصر تاریخ بھی لکھدینا مناسب معلوم ہوا،

خاندانی حالات ہندوستان میں شروانیوں کا ورود بہلول لودھی کے عہد میں ہوا، ۱۴۵۱ء میں جب اس بادشاہ نے خاندان سادات سے افغانوں کے لیے سلطنت ہند کو حاصل کیا، تو اس نے افغانستان کے قبائل کو ہندوستان آنے کے لیے ترغیب آمیز اور تحریص انگیز خطوط لکھے، چنانچہ نوع

قندھار سے چند سربرآوردہ قبیلے شیروانی، غلزئی، لودھی، سوری، لوہانی، اور نیازی ہندوستان وارد ہوئے، ان میں سے شیروانی، غلزئی اور لودھی حقیقی بھائیون کی اولاد تھے، لودھیون نے اپنی حکومت کا سکہ ہندوستان پر بٹھایا، اور شیروانی خاندان نے مسند وزارت کو زینت دی، اور سپہ سالاری کے عہدۂ جلیلہ کے حقدار قرار پائے، بہلول لودھی کے عہد مین عمر خان شیروانی وزارت کے منصب پر متمکن تھے، ان کا خطاب مسند عالی تھا، ان ہی کی کوشش سے سکندر لودھی کو دہلی کا تخت حاصل ہوا تھا، جب ابراہیم لودھی کا زمانہ آیا تو افغانی امرا اس کی بے عنوانیون اور مظالم سے تنگ آکر ملک کی مختلف سمتون مین پھیل گئے، اور افغانی قبائل کا جو شیرازہ بہلول لودھی نے باندھا تھا، وہ منتشر ہو گیا، سنہ ۱۵۴۰ء مین جب شیر شاہ نے ہمایون کو ہندوستان سے باہر نکال دیا، تو اس نے بنگال مین افغانی قبائل کی مجلس مشاورت منعقد کر کے یہ تجویز پیش کی کہ وہ جس کو چاہین اپنی مرضی سے سلطنت ہند کا مالک بنا دین، چنانچہ عمر خان شیروانی کے فرزند نے اصرار کر کے خود شیر شاہ کو تخت نشین کرایا، شیر شاہی معرکون کے بعد جب سلاطین مغلیہ نے افغانون سے برہم ہو کر ان کا قلع قمع کرنا چاہا تو خاندانِ شیروانی کے مورثون نے شاہی تعلقات کو چھوڑ کر مختلف مضافات مین زمینداریون پر قبضہ کر لیا،

مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی مرحوم کی خاندانی روایات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ خاندان شیروانی کے دو بزرگ محمد میر خان اور محمد مغیث خان نے لودھیون ہی کے عہد مین سرکار کول (یعنی علی گڈھ) کے نواح مین آکر آباد ہو گئے تھے، محمد میر خان کی اولاد پہلے موضع بردرہ میں آباد ہوئی، پھر وہان سے دتاولی، برلہ، سہاولی، سنہرہ، دھنساری اور بروالی کے مواضعات مین پھیل گئی، محمد مغیث خان کے تین بیٹے تھے، سالار الدین، رکن الدین، اور بہار الدین، موخر الذکر کی اولاد مین سے اب کوئی باقی نہین ہے، سالار الدین کی اولاد بھموری، بھیکم پور، دادون، اکبر، بوڑھا گاؤن، حسن پور، کنولی، بھاموں، ہنڈولی اور گناوہ وغیرہ مین آباد ہے، محمد مغیث خان کے دوسرے بیٹے رکن الدین کی اولاد

دیہات برہجہ، بھر سولی، علی پور، اتوا، گھنونہ، طالب پور، عنایتی وغیرہ مین آباد ہے، اور رکندی کہلاتے ہین، عبدل خان یا عبداللہ خان شیروانی خاندان کے ایک بزرگ تھے جنھون نے جہانگیری عہد مین شاہی ملازمت اختیار کی، پھر تارک الدنیا ہو کر حضرت مخدوم ثنائی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار (واقع لنگیری) پر گوشہ نشین ہو گئے، اور وہین سپرد خاک ہوئے، ان کی قبر وہان اس وقت تک موجود ہے، اس زمانہ مین اس خاندان کے مشاہیر مین نواب یوسف خان ساکن راج مئو و گناوہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، انکی شان و شوکت کے بڑے قصے مشہور ہین، ان کا سال وفات سنہ ۱۶۹۳ء بتایا جاتا ہے، روایات مین یہ بھی مشہور ہے کہ نواب یوسف خان نے عہد شاہجہانی دیکھا تھا، اور شاہجہان کے دربار مین حاضری کا شرف بھی حاصل کیا تھا، اور ان کو شاہجہان آباد منجھنہ کا موضع عطیۂ شاہی مین ملا تھا، نواب یوسف خان کی والدہ اور بہن یا لڑکی کی قبرین خاص راج مئو مین ابتک موجود ہین، خود نواب یوسف کی قبر جھاڑی گھنا گناوہ مین ایک حصار کے اندر واقع ہے، نواب یوسف خان کی شخصیت اپنے زمانہ مین بڑی ممتاز تھی، اور وہ اس وقت مرجع خلائق تھے، ان کے عروج و اقبال کی کوئی انتہا نہ تھی، اس نواح مین دور دور تک کوئی رئیس ان کے مقابلہ کا نہ تھا،

سنہ ۱۷۴۰ء سے سنہ ۱۷۷۰ء تک جاٹ گردی کے زمانہ مین پرگنہ علاقہ اترولی، سرکار کول کے حلقہ مین بوڑھا گاؤن بھموری، قلعہ چھرہ، دھنساری، دتاولی، برلہ وغیرہ کے علاقے تباہ کر دیے گئے، چنانچہ اس جاٹ شاہی عہد مین شیروانی خاندان کے افراد اپنی اپنی زمینداریان چھوڑ کر گنگا پار، کٹھیر اور سہسوان چلے گئے، پھر طوائف الملوکی کا دور ختم ہونے کے بعد گنگا پار سے واپس آکر اپنی اپنی زمینداریو پر قابض و متمکن ہوئے، گنگا پار سے واپس آنے والون کے سرگروہ بھموری کے باز خان صاحب تھے، جنھون نے اٹھائیس سال کی جلاوطنی مین بہت ٹھوکرین کھائی تھین، اور زمانہ کا بہت گرم و سرد دیکھا تھا، اس لیے جب وہ دوبارہ واپس آئے تو ایک پختہ کار اور تجربہ کار انسان اور زمیندار تھے،

اور انھون نے اپنی آبائی ریاست پر حسن تدبیر سے قبضہ کیا، بہت سے گاؤن بذریعہ بیع و نیلام حاصل کیے،
۱۷۹۱ء مین پٹہ زمینداری مین بھموری کا تعلقہ نامزد ہوا، جس مین داؤدن بھی شامل تھا، مرہٹون کے
استیلاء کے زمانہ مین یہ انتظام برقرار رہا، اس لیے بازخان صاحب کا اثر و اقتدار برابر ترقی کرتا گیا، اور جب
۱۸۲۳ء مین ان کا انتقال ہوا تو انھون نے ایک وسیع علاقہ ترکہ مین چھوڑا جس مین ۵۳ گاؤن تعلقہ بھموری
بزرگ مین، اور ۲۰ گاؤن تعلقہ تاہ اور ۲۵ گاؤن تعلقہ ہردوئی مین، ۴ گاؤن کنکتہ مین اور ۹ گاؤن
رہن مین چھوڑے، بازخان خدا ترس بزرگ اور اپنے پیر کے بڑے عقیدتمند تھے، ۱۷۹۰ء مین انھون
نے اپنے پیر کے حکم سے بھیکم پور کو دوبارہ آباد کیا، اور خود مع اہل و عیال بھموری سے وہان منتقل ہوگئے،
بازخان کی شادی دوری مین نصیب خان کی لڑکی سے ہوئی تھی، بھموری کے قیام کے زمانہ مین ۱۸۱۵ء
مین ان کو اچھلے اہیر سے داؤدن کے مقام پر ایک معرکہ پیش آیا، جس مین خاندان کے لوگون نے بھی
ان کا ساتھ دیا، اس معرکہ مین بازخان صاحب کے تلوار اور برچھے وغیرہ کے کئی زخم آئے تھے، ان کا انتقال
۱۸۳۰ء مین جب وہ حج کے لیے جا رہے تھے بمقام بڑودہ ہوا، ان کی قبر بھی بڑودہ ہی مین ہے،
ان کی بی بی جو مدینہ بی بی کے لقب سے موسوم تھین اس سفر مین ساتھ اور بڑی باہمت خاتون تھین، اس
حادثہ کے باوجود انھون نے حج کا سفر ملتوی نہین کیا اور اس فریضہ کو مع الخیر پورا کیا،

بازخان صاحب کے تین بیٹے نامور ہوئے، خان زمان صاحب جو شاخ بھیکم پور و حبیب گنج
کے مورث اعلی ہین، حاجی محمد داؤد خان صاحب جو شاخ ظفر منزل علی گڈھ کے جد اعلی تھے، اور
حاجی غلام محمد خان جو بعد تقسیم جائداد ۱۸۳۲ء مین بھیکم پور سے داؤدن منتقل ہوئے،

خان زمان صاحب ہی کی اولاد مین مولانا حبیب الرحمن خان شروانی تھے، ان کے والد ماجد
کا اسم گرامی محمد تقی خان صاحب تھا،

ولادت | مولانا حبیب الرحمن خان کی ولادت بتاریخ ۲۸ شعبان المعظم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء

صبح کے وقت بھیکم پور (ضلع علی گڈھ) مین ہوئی، لیکن مستقل سکونت حبیب گنج مین رہی، جس کو ان کے
والد ماجد نے ان ہی کے نام پر آباد کیا تھا، حبیب گنج بھیکم پور سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے،

تعلیم | کلام پاک ختم ہوا تو تعلیم کی ابتدا فارسی سے ہوئی، جو قدیم مکتبی طریقہ پر گھر ہی پر دی گئی، فارسی
نصاب مین سہ نثر ظہوری، مینا بازار اور دیوان غنی وغیرہ ختم کرلیا، تو عربی شروع کرائی گئی، باقاعدہ
طور پر درس نظامی کی تحصیل کرتے رہے، حضرت سید احمد کبیر قدس اللہ سرہٗ کے فرزندون مین سے
ایک عالم سے عربی کے ابتدائی اسباق لیے، نحو (نیز ابتدائی فقہ) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی تلمیذ
مولانا لطف اللہ سے پڑھی، لیکن زیادہ فیض مولانا عبد الغنی خان صاحب سے حاصل کیا، مولانا ممدوح سے
فقہ مین شرح وقایہ ہدایہ آخرین کتاب الرہن تک پڑھی، حدیث مین مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر مین
جلالین و تفسیر بیضاوی (ابتدائی حصہ) اور علم معانی مین مختصر المعانی پڑھتے رہے، فن منطق کی تکمیل
علی گڈھ مین مولانا لطف اللہ سے کی، اور ان ہی سے حمد اللہ قاضی مبارک میر زاہد رسالہ مع حاشیہ
غلام یحییٰ پڑھا، حدیث مین شمائل ترمذی اور صحیح بخاری (۹ پارے) سبقاً سبقاً شیخ حسین صاحب
یمنی بھوپالی سے پڑھی، اور باقی کتابون کی اجازت و سند بھی لی، حدیث کی دو سندین سفر حرمین
مین حاصل کین، ایک شیخ حبیب اللہ شنقیطی سے اور دوسری شیخ عمری سے، ایک حدیث مسلسل
بالاولیت کی سند میان سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری سے بھی حاصل فرمائی، قرأت مین قصیدہ
جزریہ قاری عبد الرحمن (مدرس احیاء العلوم الہ آباد) سے پڑھا، شاہ ولی اللہ صاحب کی چہل حدیث
قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی سے پڑھی،

آگرہ کالجیٹ اسکول مین انٹرنس تک انگریزی تعلیم بھی پائی، اگرچہ انٹرنس کا امتحان
نہین دیا، لیکن یکے بعد دیگرے چار انگریزون سے انگریزی پڑھنے اور لکھنے کی مشق کرتے رہے،
آگرہ سے واپسی کے بعد علیگڈھ مین محمڈن کالج کے ہڈ ماسٹر مسٹر موٹ سے انگریزی لٹریچر پڑھا،

تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے زمانہ کے تمام مشاہیر صلحاء و علماء، مثلاً مولانا معین القضاۃ صاحب لکھنوی، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری، مولانا احمد حسن صاحب جونپوری، مولانا عبد المقتدر صاحب بدایونی، مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی، مولانا ابو الخیر صاحب مجددی، شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی، خواجہ الطاف حسین حالی، حبیب عبد روس صاحب یمنی حیدر آبادی سے گہرے مراسم قائم رکھے، اور ان بزرگون سے علمی فیض حاصل کرتے رہے، مولانا شبلی مرحوم سے قلبی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا، اور بہت سے علمی و تعلیمی کامون مین ان کے شریک کار رہے،

بیعت کی سعادت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی قدس سرہ العزیز سے حاصل کی تھی،

علمی ذوق کا نشوونما علمی ذوق کا آغاز غالب کی اردوے معلی کے مطالعہ سے ہوا، جس کو انھون نے اپنے والد ماجد کے حکم سے پڑھنا شروع کیا تھا، اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد گلزار داغ کا مطالعہ کیا، اگرچہ ان کے چچا صاحب نے اس ذوق پر زجر فرمایا، لیکن طبیعت کی افتاد شوق دلاتی رہی، اور رفتہ رفتہ جب وہ زمانہ آیا کہ اپنی مرضی سے کتابون کا انتخاب کرین تو عربی کی متقدمین کی تصانیف کو زیادہ پسند کیا، اسی زمانہ مین کلام پاک کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہے، فارسی مین متاخرین ایران کی سحر آفرینی سے زیادہ مسحور ہوے، اردو مین شعراے دہلی کا کلام زیادہ پسند تھا، شاعری مین امیر مینائی سے تلمذ حاصل تھا، کئی سال تک استاذ سے مراسلت اور اصلاح کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن دونون مین ملاقات نہ ہو سکی، فارسی شاعری کے ذوق کا نشوونما مولانا شبلی، مولانا عبد الغنی خان، خواجہ سنجر طہرانی، خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی اور خواجہ غلام غوث خان صاحب بیخبر الہ آبادی کی صحبت مین ہوا،

مضمون نگاری ۱۸۸۳ء سے مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا، اور لسان العصر سید اکبر حسین مرحوم نے بلنٹ کی کتاب فیوچر آف اسلام کا اردو ترجمہ مستقبل اسلام کیا، تو اس پر تبصرہ لکھا جو مولوی غلام محمد خان صاحب تپش کے اخبار مشیر قیصر لکھنؤ مین شائع ہوا، یہ غالباً ان کا پہلا مضمون تھا، اس کے بعد مختلف اخبارات مثلاً اودھ اخبار لکھنؤ، آزاد لکھنؤ، البشیر اٹاوہ، سر مور گزٹ، اکمل الاخبار دہلی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ مین مضامین لکھتے رہے، ۱۸۹۱ء مین رسالہ حسن حیدر آباد دکن مین ایک انعامی مضمون ظہیر الدین شاہ بابر پر لکھا، اور اودھ کی طرف سے ایک اشرفی انعام ملی، پھر ملک کے مختلف رسائل دلگداز لکھنؤ، مخزن لاہور، معارف علی گڑھ، زمانہ کانپور، علی گڑھ میگزین، اولڈ بواے علی گڑھ، خاتون علی گڑھ، اردوے معلی علی گڑھ، نظام المشائخ دہلی، الندوہ لکھنؤ، اور معارف اعظم گڈھ کو اپنے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین سے رونق بخشتے رہے، رسالہ الندوہ لکھنؤ کی اڈیٹری مین مولانا شبلی مرحوم کے شریک ادارت تھے، جو ان کی اعلیٰ علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کا ثبوت ہے، ۱۸۸۵ء سے ۱۹۴۷ء تک جتنے مضامین لکھے ان کا مجموعہ **مقالات شروانی** کے نام سے علی گڈھ سے شائع ہوگیا ہے،

تصانیف تذکرۂ بابر کے علاوہ **ذکر حبیب** اور **ذکر جمیل** کے نام سے میلاد مبارک کے لیے دو کتابین تحریر فرمائین، **علماے سلف** مین علماے اسلام کے حالات ہین، **نابینا علماء** مین ان علماء کا ذکر ہے جنھون نے نابینائی کی حالت مین تحصیل علم اور ناموری حاصل کی، **سیرۃ الصدیق** مین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالات ہین، جس کو ابتداءً محمڈن کالج علی گڈھ کے طلبہ کے سامنے بطور لکچر پڑھا تھا، ایک رسالہ **اخلاقی لکچر** ہے جس مین اخلاق اسلامی کا بیان ہے، یہ لکچر بھی محمڈن کالج کے طلبہ کے سامنے پڑھا گیا، اور طلبہ کے نصاب مین داخل ہوا، ۱۹۱۷ء مین امیر خسرو کی مشہور مثنوی مجنون لیلیٰ کو تصحیح کر کے شائع کیا، جس کے شروع مین ان کے قلم سے ۱۱۵ صفحے

کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے، میر حسن کا تذکرۂ شعرائے اردو جو انجمن ترقی اردو سے شائع ہوا ہے، اس کا انشا پردازانہ مقدمہ ان ہی کا لکھا ہوا ہے، اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کئی رسائل وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے، مثلاً (۱) **اسلامی اخلاق** جس میں اخلاق پر دلنشین بحث کے بعد اچھے اور برے اخلاق کے متعلق حدیثوں کا اردو ترجمہ دیا ہے (۲) **فقہ حنفی** جس میں فقہ حنفی کی تاریخی اور محدثانہ حیثیت پر بحث ہے (۳) **تبصرہ**، یہ تاریخ خطیب بغدادی پر عالمانہ ریویو ہے (۴) **عرض اخلاص** یہ ایک تقریر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان لڑکیاں زمانہ کے مطابق تعلیم ضرور پائیں لیکن اسلامی شعار اور معاشرت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں (۵) **سرسید کی یاد**، اس کو ۲۸ مارچ ۱۹۳۹ء کو مسلم یونیورسٹی کے یونین ہال میں پڑھا جس میں سرسید کی تعلیمی جد و جہد کا ذکر نہایت دلچسپ پیرایہ میں کیا ہے، (۶) **نقش وفا** میں حقوق و فرائضِ زوجین پر بہت سی مفید ہدایات ہیں (۷) **استاذ العلماء** میں حضرت مفتی محمد لطف اللہ مرحوم کے سوانح ہیں، جن کے ضمن میں مفتی عنایت اللہ صاحب شہید اور استاذ الاساتذہ مولوی بزرگ علی صاحب کے کچھ حالات بھی آ گئے ہیں (۸) **حالات حزین**، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس میں فارسی کے مشہور شاعر علی حزین پر ایک پرمغز مقالہ پڑھا، اس میں حزین کے کلام کا انتخاب بھی ہے (۹) **ذکر محبوب** میں حضرت عبد القادر جیلانیؒ کے حالات ہیں (۱۰) **قرۃ العین** میں حضرت مجدد الف ثانی کے سوانح ہیں (۱۱) **مسلمانوں کی تعلیم قدیم** میں قدیم تعلیم کا نصب العین بتایا ہے (۱۲) **تعلیم اسلام کا اثر عمر و صحت پر**، اس میں بزرگان دین کی عمر کی درازی کا حال لکھ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی کما حقہ پابندی قیام صحت کا باعث ہوتی ہے (۱۳) **برق تجلی**، اس میں حسن و عشق کی زندگی پر تبصرہ ہے،

میلاد النبی کے موقع پر کچھ نہ کچھ ضرور تقریر فرماتے، اور اس کو قلمبند کر لیتے، بعض ایسے رسائل کے نام یہ ہیں **آفتاب رسالت**، **شان رسالت**، **رسالت عامہ**، **ذکر شریف**،

پیغام رحمت، **شمع ہدایت**،

اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے اردو اور فارسی کلام کے علیحدہ علیحدہ مجموعے بھی شائع کیے تھے،

نادر کتب خانہ ان کے علمی ذوق اور اسلامی علوم و فنون سے ان کے شغف کا یہ بین ثبوت ہے کہ انھوں نے اپنی محنت سے زر کثیر صرف کر کے ایک بڑا نادر اور قیمتی کتب خانہ جمع کیا جس میں پانچ ہزار سے زیادہ مطبوعہ اور نایاب قلمی عربی اور فارسی کتابیں ہیں، اردو اور انگریزی کی کتابوں کا بھی ایک حصہ ہے، مولانا شبلی مرحوم کا خیال تھا کہ فارسی کلام کا جیسا اچھا ذخیرہ حبیب گنج کے کتب خانہ میں ہے، رامپور اور بانکی پور کے کتب خانہ میں بھی نہیں، "حبیب گنج کا کتب خانہ کس طرح جمع ہوا" کے عنوان سے خود مولانا شروانی مرحوم نے معارف (اکتوبر ۱۹۳۱ء) میں ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے، اپنی زندگی ہی میں اس کتب خانہ کو مسلم یونیورسٹی پر باضابطہ وقف کر دیا تھا،

قومی مشاغل سیاست سے ان کو ذوق نہ تھا، اور اس سے وہ ہمیشہ کنارہ کش رہے، لیکن مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تحریکوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے، ہوش سنبھالا تو علی گڈھ میں سرسید احمد خاں کی تحریک کا چرچا سنا، جس میں خود ان کے خاندان کے کئی افراد شریک تھے، مولانا شروانی کو اگرچہ سرسید مرحوم کے بعض مذہبی خیالات سے اختلاف تھا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے ان کی مفید علمی تحریک میں پورا حصہ لیا، اور سرسید نے ان کو اپنے کالج کا ٹرسٹی منتخب کیا، محسن الملک مرحوم کی معتمدی کے زمانہ میں وہ اہل سنت جماعت کے دینیات کی تعلیم کے سکریٹری مقرر ہوئے، مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے زمانہ میں میر کمشنری کی کمیٹی کے سکریٹری بنائے گئے، اور اس سلسلہ میں متعدد وفود میں شرکت کی، اور تحریک کی اشاعت میں تقریریں کیں، نقد چندہ دیا، اور جب مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی برابر کورٹ کے ممبر رہے، اور مختلف اوقات میں یونیورسٹی کی اگزکٹو کونسل، اکیڈمک کونسل کے ممبر مقرر ہوتے رہے، اور دینیات کی تعلیم کے مستقل نگران مقرر ہوئے، ۱۹۲۱ء میں مسلم

یونیورسٹی نے ان کے علمی و تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ان کو ڈاکٹر آف تھیولوجی کی اعزازی ڈگری دیکر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا،

۱۸۹۰ء سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر تھے، ۱۹۱۷ء میں جب صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب انگلستان تشریف لے گئے تو مولانا شروانی کانفرنس کے جائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد جب کالج کے آنریری سکریٹری کا عہدہ ختم ہوگیا جو کانفرنس کا سکریٹری بھی ہوتا تھا تو ۱۹۲۰ء میں مولانا شروانی کانفرنس کے سکریٹری مقرر ہوئے، اور اپنی وفات کے کچھ دنوں پہلے تک اس عہدہ پر مامور رہے، بالکل آخر میں ضعف پیری کی وجہ سے اس سے مستعفی ہوگئے تھے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بعض اجلاسوں کی صدارت بھی فرمائی،

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شروع سے تعلق تھا، وہ اس کے رکن رکین اور بڑے معاون و مددگار تھے، اس کے تین سالانہ اجلاسوں کی صدارت بھی کی،

دار المصنفین سے بھی ان کو قلبی تعلق تھا، ۱۹۳۱ء سے آخر تک اس کی مجلس ارکان اور مجلس انتظامیہ کے ممبر رہے،

کرنال کے وقف کے بھی نگران تھے، اس کا جو معاوضہ ان کو ملتا تھا، وہ اس کو کسی نہ کسی ادارہ کو دیدیتے تھے،

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے بھی ممبر تھے، ۱۹۲۸ء میں اس کا پانچواں اجلاس لاہور میں ہوا، تو اس کے شعبۂ اردو کے صدر مقرر ہوئے، اس موقع پر جو خطبۂ صدارت انھوں نے پڑھا، اس پر تحسین و آفرین ہوئی، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کی بھی ۱۹۳۷ء میں صدارت فرمائی، یو، پی ہسٹاریکل سوسائٹی، مسلم گرلز کالج علی گڈھ، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، انجمن حمایت اسلام لاہور اور طبیہ کالج دہلی، آرٹس سوسائٹی لندن سے بھی مختلف شکلوں میں وابستہ رہے،

قیام حیدرآباد دکن

نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ کی وفات کے بعد مملکت آصفیہ کے عہدۂ صدر الصدور پر ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں فائز ہوئے، اور اس منصب پر بارہ تیرہ سال رہے، صدر الصدوری سے متعلق دو صیغے تھے، صدارت العالیہ اور امور مذہبی، صدارت العالیہ خالص اسلامی صیغہ تھا، جو حضور نظام کے براہ راست ماتحت تھا، امور مذہبی ایک عاملانہ صیغہ تھا، جو ممالک محروسہ سرکار آصفیہ کے عام مذہبی نظم و نسق سے متعلق تھا، مولانا شروانی نے ان دونوں صیغوں کی اصلاح بڑی توجہ اور سرگرمی سے کی، جس کا صلہ ان کو ۱۳۴۱ھ میں "نواب صدر یار جنگ" کے خطاب کی شکل میں ملا، قیام حیدرآباد کے زمانہ میں یہاں کے باشندوں پر ان کی پاکیزہ سیرت کا بڑا گہرا اثر پڑا، وہاں کی تمام علمی و ادبی تحریکوں میں انکا نمایاں حصہ رہا، اور نواب عماد الملک مرحوم کے ذمہ جو ادبی فرائض تھے وہ ان کے بعد ان ہی کے سپرد کر دیے گئے، اور جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے، جامعہ کی مجلس دینیات کے بھی امیر تھے، اور اپنے قیام کے دوران میں کتبخانہ آصفیہ کی مجلس ذیلی کے صدر الصدور اور مجلس انتظامی کے نائب صدر، اشاعت علوم کے صدر، دائرۃ المعارف کے رکن، مدرسہ نظامیہ کی مجلس کے صدر اور انجمن احترام اوقات مطہرہ کے نگران اعلیٰ بھی رہے، انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن میں تھی، تو مولانا عبد الحق سے پہلے اس کے بھی سکریٹری تھے،

حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۰ء میں پنشن پائی، حیدرآباد ہی کے قیام کے زمانہ میں غالباً ۱۹۲۶ء میں حرمین شریفین کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے، مکہ معظمہ میں قاری سید عبد الرحیم کو پورا کلام پاک سنایا، اور مدینہ طیبہ میں قاری حسن شاعر سے ان کا رسالہ قرأت پڑھا، ان سے آخری سبق مسجد نبوی میں لیا، اور قرأت کی سند حاصل کی،

حیدرآباد سے سبکدوشی کے بعد ان کی زیادہ تر توجہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی، دار المصنفین اور ندوۃ العلما کی طرف رہی،

وفات ۸۰ سال کی عمر میں ایک ہفتہ کی شدید علالت کے بعد ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء مطابق ۲۷ شوال المکرم بروز جمعہ بوقت صبح عالم جاودانی کو سدھارے، دوران علالت میں زیادہ تر اللہ اور رسول کی باتین کرتے رہے، اور انگلیون مین پڑی ہوئی تسبیح کے ورد سے غافل نہ ہوتے، طہارت کا برابر خیال رکھتے، روح پرواز ہونے سے پانچ منٹ پہلے تک باتین کرتے رہے، اور جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا، تو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، جنازہ ایک فوجی کار مین مسلم یونیورسٹی کے کرکٹ لان پر لایا گیا، اس کے پیچھے پیچھے مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ، اور شہر کے حکام، رؤسا اور معززین بھی ساتھ تھے، نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد میت علی گڈھ سے ۲۶ میل دور موضع بھموری متصل حبیب گنج کے خاندانی قبرستان مین لے جائی گئی جہان علم وفضل، امارت و حشمت اور وقار و سنجیدگی کا پیکر پیوند خاک کر دیا گیا،

اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی تربت کو ہمیشہ ٹھنڈی رکھے، آمین ثم آمین،

حیات شبلی

یہ کتاب تنہا علامہ شبلی مرحوم کی سوانح عمری نہین ہے، بلکہ اس مین انکی وفات ۱۹۱۴ء تک اسکے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندستان کے مسلمانون کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، اصلاحی اور دوسری تحریکون اور سرگرمیون کی مفصل تاریخ آگئی ہے، شروع مین جدید علم کلام کی نوعیت، اسکی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر خلجی اور تغلق کے زمانہ سے لیکر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ کے مسلمانون کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کیے گئے ہین،

صفحات ۸۴۶ صفحے، قیمت: مجلد عہ غیر مجلد: لعہ

"منیجر"

ادبیات

ماتم حبیب شبلی

از جناب یحییٰ اعظمی

محو آرام ہوئے جا کے قریب شبلی
آہ رخصت ہوئے دنیا سے حبیب شبلی

دانش افروز کہن، یار ادیب شبلی
ہر نوا جنکی تھی پیغام نقیب شبلی

قدر دان ادب و فلسفۂ نعمانی
سرپرست ہنر کہنہ و نو شروانی

آج قائم تھا انھین سے شرف دانش و دین
آہ تھے بزم "معارف" کے وہی صدر نشین

شکل دیکھو تو زسر تا بہ قدم نور یقین
جن سے اس دور مین تازہ تھی سلف کی تمکین

ہو گیا ختم وہ دور رنگین افسوس
تیرہ و تار ہوئی مجلس دو شین افسوس

کس کو توفیق نے بخشا تھا وہ گل ریز قلم
کس کو قدرت نے دیا تھا وہ دل آویز قلم

گہر افشان، گہر آرا، گہر انگیز قلم
نظم و نثر و ادب و فن بہم آمیز قلم

جس کے ہر نقش مین رنگینی و رعنائی تھی
جس کے ہر حرف مین صد حسن و دل آرائی تھی

آج سنسان ہوا میکدۂ دانش و فن
اٹھ گیا بزم سے جو ساقی صہبائے کہن

ہو گیا نذرِ خزاں حکمت و عرفاں کا چمن وقفِ ماتم ہے جہانِ ادب و شعر و سخن

دیکھئے جن کو شریکِ غم و ماتم ہیں سبھی

مجلسِ علم "بھی" دانش کدۂ قومی "بھی"

آہ تنہا نہیں یہ حکمت و فن کا ماتم آہ تنہا نہیں یہ شعر و سخن کا ماتم

ہے حقیقت میں یہ تہذیبِ کہن کا ماتم سچ جو پوچھو تو ہے اک شیخِ زمن کا ماتم

غم ہے وہ حکمت و اسرار کا عارف نہ رہا

غم ہے سر دفتر "اربابِ معارف" نہ رہا

اب کہاں اٹھتے ہیں اس وضع کے اربابِ کمال اب کہاں دولتِ تقویٰ کی یہ پاکیزہ مثال

قدر والا تھا کہ سر تا بہ قدم سر و جلال جس میں تھا صورت و معنیٰ کا دل آویز جمال

مظہرِ علم و ہنر پیکرِ زیبائے ادب

جس کی ہر فکر و نظر سرخوشِ صہبائے ادب

اک امیرِ اور حقائق کے یہ اسرار و نکات اک رئیس اور معارف کے یہ پاکیزہ صفات

کس نے پائی ہے یہ رخشندہ و تابندہ حیات صرف اک ذاتِ گرامی کی نہیں ہے یہ وفات

کاروانِ حکمت و دانش کا رواں ہوتا ہے

قافلہ فضل کا آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے

دورِ تابندۂ تحقیق کی رحلت یہ ہے ثانی شبلی مرحوم کی رخصت یہ ہے

دفن سر تا قدم اسرار کی دولت یہ ہے علم کے گنجِ گراں مایہ کی تربت یہ ہے

اے خدا تو اسے اب نور سے کر دے معمور

اس پہ ہوتا رہے دائم تری رحمت کا ظہور

۲۷

ہے مجھ کو اس کتاب میں دین کا پورا لب لباب آگیا ہے، اور قرآن و حدیث سے وہ سب تعلیمات میں اسباق

کی شکل میں جمع کر دی گئی ہیں جن سے واقف ہو کر اور جن پر عمل کر کے ایک عام مسلمان بھی نہ صرف اچھا مسلمان

مطبوعات جدیدہ

اسلام کیا ہے مولفہ جناب مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۴۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ، پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ، لکھنؤ۔

آج مسلمانوں کو اسلام سے عملاً بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اور ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اسلام کی حقیقت تک سے ناآشنا اور اسلامی زندگی کے صحیح تصور سے بھی بیگانہ ہو اور مسلمان نام رہ گیا ہے صرف مسلمان کہلانے کا، یا زیادہ سے زیادہ زبان سے کلمہ توحید پڑھ لینے اور روزہ و نماز کی ظاہری صورت کسی نہ کسی شکل میں ادا کر لینے کا، اس کے علاوہ دوسرے اسلامی فرائض کا احساس بھی نہیں رہ گیا ہے، اس لیے فاضل مصنف نے جنکو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی روح کو سمجھنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی خاص توفیق عطا فرمائی ہے، اس کتاب میں کلام مجید اور احادیث نبوی سے اسلام اور اسلامی زندگی کی حقیقت بیان فرمائی ہے، اور اس کے تمام اجزاء، توحید، عبادات، روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ، تقویٰ و پرہیزگاری، معاملات، اخلاق، معاشرتی حقوق و فرائض، اللہ اور اس کے رسول کی محبت، دین سے تعلق، اس پر استقامت، اس کی خدمت و نصرت و حمایت، عالم برزخ، عالم آخرت، جنت و دوزخ، ذکر اللہ، توبہ و استغفار وغیرہ اسلام کے جملہ ارکان اور اس کے تکمیلی عناصر یعنی اسلام، ایمان و احسان اور اسلامی زندگی کے ہر شاخ اور ہر پہلو کی پوری تفصیل اور نہایت موثر اور دلنشین انداز میں اس کی تشریح اور اسکی روح بیان کر دی ہے، اور اسکا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ "اس کتاب میں دین کا پورا لب لباب آگیا ہے، اور قرآن و حدیث سے وہ سب تعلیمات سبق اسباق کی شکل میں جمع کر دی گئی ہیں جن سے واقف ہو کر اور جن پر عمل کر کے ایک عامی مسلمان بھی نہ صرف اچھا مسلمان

اے خدا اب تو رحمت ...

اس پہ ہوتا ہے دائم تری رحمت کا ظہور

بلکہ انشاء اللہ مومن کامل اور ولی بن سکتا ہے"، اس لیے یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اس سے فائدہ اٹھائے، بلکہ اس میں اسلام اور اسلامی زندگی کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے، اس لیے وہ ان غیر مسلموں کے بھی مطالعہ کے لائق ہے جو اسلام کے متعلق غلط خیالات رکھتے ہیں، اس سے اسلام کی صحیح تصویر ان کے سامنے آجائے گی،

جمہوریت اور مغربی تحریکیں مترجمہ جناب مولوی عبدالوہاب صاحب ظہوری پروفیسر نظامیہ طبیہ کالج، تقطیع بڑی ضخامت ۲۶۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے ریتہ: مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد دکن،

ڈاکٹر ایڈورڈ بینس سابق صدر جمہوریہ چیکوسلواکیہ یورپ کے مشہور سیاست دان، صحیح جمہوریت کے علمبردار، انسانی برادری میں حقیقی مساوات کے داعی اور امن عالم کے بڑے مبلغ ہیں، اس مقصد کے حصول کیلیے انھوں نے چند خطبات دیے تھے، جن کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے، لائق مترجم نے اسی کا اردو ترجمہ کیا ہے، جمہوریت بلا امتیاز رنگ و نسل تمام انسانوں اور قوموں میں آزادی و مساوات کی داعی اور اس کی بڑی محافظ و پاسبان سمجھی جاتی ہے، اور اس لحاظ سے جمہوری نظام حکومت سارے نظاموں میں بہتر سمجھا جاتا ہے، لیکن یورپ میں جو جمہوریت عملاً رائج ہے، وہ صحیح جمہوری روح سے خالی ہے، اور اس میں ایسے بنیادی نقائص ہیں کہ وہ آزادی مساوات اور قیام امن کے بجائے نسلی تفوق و برتری، قومی و جغرافی تفریق، طبقاتی تقسیم، معاشی ناہمواری، سیاسی کشمکش اور جنگ و خونریزی کا ذریعہ بن گئی ہے، ان ہی نقائص کی بنا پر اس کے متوازی اشتراکیت، نازیت اور آمریت کی تحریکیں پیدا ہو گئیں، اور قومی خود غرضی اور اقتصادی ناہمواری سے جنگ و جدال کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گیا، جس نے نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کے امن و سکون کا خاتمہ کر دیا، اور اس کے انسداد کی جتنی تدبیریں اختیار کی گئیں وہ سب بنیادی خرابیوں کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکیں، اور آج پھر دنیا ایک بڑی جنگ کے آتش فشاں کے دہانہ پر کھڑی ہے، مصنف نے اس کتاب میں انقلاب فرانس سے لیکر جب سے یورپ میں جمہوریت کی بنیاد پڑی، گذشتہ جنگ کے خاتمہ تک یورپ کے سیاسی انقلابات، یورپین

قوموں کی سیاسی و اقتصادی کشمکش، ان کی لڑائیوں، مختلف سیاسی نظریوں اور تحریکوں کی روشنی میں جمہوریت کے نقائص اور اس سے پیدا شدہ مذموم نتائج پر مفصل تبصرہ کیا ہے، جس سے یورپ کا گذشتہ چند صدیوں کا پورا سیاسی مد و جزر اور اسکے اسباب و نتائج سامنے آجاتے ہیں، کتاب کے آخر میں مصنف نے صحیح جمہوریت کے بارہ میں جو حقیقی آزادی و مساوات کی ضامن ہو اور جس کے ذریعہ دنیا میں امن و امان قائم ہو سکے، اپنا مشورہ پیش کیا ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے اور یہ کتاب سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

اردو ادب کے معمار تقطیع اوسط، ضخامت ۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن،

اردو زبان کی تعمیر و ترقی کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے، اور اس میں ہر زمانہ کے نامور شعراء و ادیبوں کی کوششیں شریک رہی ہیں، اس کتاب میں یہ جدت کی گئی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی و غواصی سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے اردو زبان کے ان چھتیس شعراء اور ادیبوں کے حالات، جنکا اردو کی تعمیر و ترقی میں حصہ رہا ہے، موجودہ دور کے ممتاز اور نامور اہل قلم کی تحریروں سے لیکر مرتب کیے گئے ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ انتخاب کس اصول پر کیا گیا ہے، اس کے دو ہی اصول ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ کسی شاعر یا ادیب کی خدمت زبان مسلم ہو، یا یہ کہ جس کے حالات کسی ادیب نے لکھے ہوں، لیکن ان دونوں اصولوں کے لحاظ سے ہر دور کے بہت سے شعراء، ادیبوں اور اردو کے معماروں کے حالات چھوٹ گئے ہیں، پرانے اساتذہ میں، مومن، آتش اور دبیر جیسے معماران اردو کے حالات نہیں ہیں، داغ کا حال ہے مگر امیر مینائی کا نہیں ہے، حالانکہ ان سب کے حالات، ممتاز ادیبوں کے قلم سے موجود ہیں، یہ صرف چند نام لکھ دیے گئے ہیں، ورنہ اس قسم کے بہت سے شعرا خصوصاً نثر نگاروں کے حالات نہیں لیے گئے ہیں، اور موجودہ زمانہ کے تو بہت سے مسلم شعراء و ادیب چھوٹ گئے ہیں، تاہم اس کتاب میں ایک جدت ضرور ہے، کتاب کے شروع میں اردو زبان کی مختصر تاریخ ہے،

حج بیت اللہ

از جناب مولوی محمد داؤد صاحب راز، تقطیع جیبی، ضخامت ۲۲۲ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ: شوقی برادران، مالیگاؤں ضلع ناسک،

اردو میں حج کے بہت سے سفرنامے اور مناسک حج پر مستقل کتابیں موجود ہیں، حج بیت اللہ اس موضوع پر بنی جامع کتاب ہے، اس میں عرب کا جغرافیہ، حرمین کی تاریخ، اس کے مقدس آثار و مقامات کی تفصیل، حج کے مناسک، اس کے متعلق ضروری مسائل، اور انکے اسرار و حکم کو اختصار و جامعیت کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، جس سے مناسک حج، اور اس کے مسائل کے ساتھ حرمین کے متعلق بہت مفید مذہبی و تاریخی معلومات حاصل ہو جاتے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب حج کی معلم بھی ہے اور حرمین کی تاریخ بھی، تاریخی حالات کی توضیح کے لیے حج کے اور مقدس مقامات کے متعدد نقشے اور فوٹو بھی دیدیے گئے ہیں،

تلقین حق

از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم، اے، تقطیع اوسط، ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱۰، پتہ ادارۂ تعلیمات اسلامی نمبر ۳ امین آباد پارک لکھنؤ،

مصنف کی نظر دوسرے مذاہب اور ان کے صحیفوں پر بہت وسیع ہے، یہ کتاب انھوں نے بچوں کے لیے اسلام پر تحریر فرمائی ہے، اس میں دوسرے مذاہب کے مشرکانہ عقائد اور ان کی افسانہ طرازیوں کے مقابلہ میں اسلام کی توحید خالص، اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانوں کی ہدایت کے سامان: وحی کی حقیقت، دوسرے صحیفوں کے مقابلہ میں کلام مجید کی خصوصیات، اس کے خاص خاص مضامین مثلاً وغیرہ اور روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ، اور اسلام کی دوسری اہم تعلیمات، اس کے اوامر و نواہی، حلال و حرام، اخلاق حمیدہ و رذیلہ وغیرہ اسلام کے عقائد و اعمال کو مختصراً سادہ اور سلجھی ہوئی زبان میں تحریر کیا گیا ہے، گو یہ رسالہ بچوں کے لیے لکھا گیا ہے، لیکن افادہ کے لحاظ سے ہر عمر کے اشخاص کے مطالعہ کے لائق ہے،